Scanned by CamScanner

سیمنار کی افتتاحی تقریب میں بائیں جانب مائک پر سبھا کے ٹرسٹی اور سکریٹری جناب فیروز پیچ سامعین سے خطاب کرتے ہوئے۔ اسٹیج پر ڈاکٹر احرار اعظمی ہندستانی زبان کے نائب مدیر، درمیان میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر صفی الدین ندوی اور آخر میں سبھا کے ڈائرکٹر اور ہندستانی زبان کے مدیر جناب سنجیونگم۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر صفی الدین ندوی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے۔

جناب فیروز پیچ، مہمانِ خصوصی ڈاکٹر صفی الدین ندوی کو مومینٹو پیش کرتے ہوئے، ساتھ میں سنجیونگم صاحب۔

اسٹیج پر دائیں جانب سے ڈاکٹر احرار اعظمی، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد (صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی)، سبھا کے پروگرامر جناب راکیش کمار ترپاٹھی، جناب سنجیونگم، ڈاکٹر محمد تابش خان (جز وقتی اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی) اس سے متصل تصویر میں ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے، اور پیچھے کی جانب شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی کے طلبا دیکھے جا سکتے ہیں۔

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

سہ ماہی رسالہ

ہندستانی زبان

خصوصی شمارہ، اکبر الہ آبادی نمبر

Listed in UGC-CARE List

RNI No. MAHURD/2015/66804
ISSN 0378-3928

سال : ۸ | جنوری۔مارچ ۲۰۲۲ء | شمارہ : ۱

مضامین:

پبلشر
فیروز این بچ
(ٹرسٹی و اعزازی سکریٹری ہندستانی پرچار سبھا)

مُدیر اعلیٰ
سنجیو نگم

نائب مدیر
ڈاکٹر شیخ احرار احمد

قیمت:
-/70/روپے فی شمارہ
سالانہ: -/250/روپے
بیرون ملک -/700/روپے فی شمارہ
بیرونِ ملک سالانہ: -/2500/روپے
(دو سال سے زائد کا زر سالانہ قبول نہیں کیا جائے گا)
منی آرڈر/ چیک
'Hindustani Prachar Sabha'
کے نام سے بھجوائیں۔

پرنٹر و پبلشر جناب فیروز این بچ، مالک ہندستانی پرچار سبھا نے سنجیو نگم کے زیر ادارت فارچون پرنٹ 'این' بائنڈ پرائیوٹ لمٹیڈ، ۲۲۵، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱ پرگتی انڈسٹریل اسٹیٹ، این۔ایم۔ جوشی مارگ، (ڈیلائل روڈ)، لوور پریل (مشرق)، ممبئی۔۴۰۰۰۱۱، سے چھپوا کر ہندستانی پرچار سبھا، مہاتما گاندھی میموریل بلڈنگ، ۷، نیتاجی سبھاش روڈ، ممبئی۔۴۰۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ "ہندستانی زبان" میں شائع شدہ مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ متعلقہ مصنف کے ہیں۔ ان سے ایڈیٹر یا پبلشر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ "ہندستانی زبان" میں شائع شدہ مضامین کے استعمال کے لیے مصنف اور

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر، مہاتما گاندھی میموریل بلڈنگ، 7، نیتاجی سبھاش روڈ، چرنی روڈ، ممبئی۔۴۰۰۰۰۲، فون: 22812871، فیکس 22810126
E-mail :hindustanizabanurdu@gmail.com, www.hpsmumbai.org

ہماری بات

گذشتہ سال اکبرالہ آبادی نمبر شائع کرنے کا ارادہ تھا جس کے لیے ہم نے اعلان بھی کیا تھا لیکن اسی درمیان شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی رحلت کے سبب اسے ملتوی کرنا پڑا۔ بعد میں یہ طے ہوا کہ اکبر پر ایک سمینار بھی ہو جائے کیوں کہ موقع بھی تھا اور دستور بھی۔ اکبر اردو شاعری میں صرف طنزیہ و مزاحیہ شاعری ہی نہیں بلکہ احتجاجی شاعری کے باقاعدہ آغاز کے ابتدائی شعرا میں سے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اردو میں باقاعدہ احتجاجی شاعری کا تاجدار شبلی کو تسلیم کیا گیا ہے۔

غدر کے بعد سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے مدنظر قومی رہنماؤں نے نئی روشنی یعنی مغربی تعلیم کو عصری تقاضے کے طور پر متعارف کیا تو اس نئی روشنی میں ہندوستانیوں کو صرف مغربی تعلیم ہی نہیں بلکہ وہاں کی تہذیب اور تمدن کی رعنائیاں بھی نظر آئیں۔ اس طرح مغرب پسندی کے بجائے مغرب پرستی کے رجحان میں اضافہ ہوا۔ مغربی طرزِ معاشرت نے جیسے ہی مشرق کو اپنا جلوہ دکھایا تو اندھی تقلید کا تسلسل ظہور میں آیا، جس کے ردعمل میں 'اودھ پنچ' اور دیگر اخبارات و رسائل کے ذریعہ قلم کے سپاہیوں نے مشرقی تہذیب، تمدن اور ثقافت کا دفاع کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر کی عوام کا کثیر حصہ مغربی روشنی میں اندھی تقلید سے گریزاں رہا۔ مشرق پرست ان قلم کے سپاہیوں میں اکبر کا نام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ مشرق و مغرب کے سنگم پر جب بھی خیال جاتا ہے تو درمیان میں مشرقی قدامت پسند اکبر کا ہیولا باندھ کی طرح نظر آتا ہے۔

اکبر ہمہ جہت خداداد تخلیقی صلاحیتوں کے حامل تھے لیکن انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا بیش تر حصہ مغربی تہذیب اور طرزِ تعلیم کی مخالفت میں صرف کیا۔ مغربی طرزِ تعلیم سے مراد وہ تعلیم جس سے مشرقی معاشرے میں بے حیائی عام ہو، مشرقی اقدار کی ناقدری ہو۔ اکبر اس معاملے میں کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انھیں نئی روشنی کے پرستاروں نے قدامت پرست اور تنگ نظر کے ساتھ ساتھ بہت کچھ کہا لیکن وہ ان سب سے بے نیاز اپنی روش پر گامزن رہے اور اپنی ادائے خاص، ظرافت کی کمان ہمیشہ تنی رکھے۔

اکبر نہ تو قومی رہنما تھے اور نہ ہی معلم اخلاقِ معاشرہ لیکن اپنی ظریفانہ شاعری سے جو کام انھوں نے لیا وہ رہنما اور معلم سے بھی نہیں ہو سکا۔ ان کی صد سالہ برسی پر اس بات کی ضرورت سبھی نے محسوس کی کہ اکبر کی ظریفانہ شاعری کو یاد کرتے ہوئے ان پر سمینار کیا جائے اور خاص نمبر شائع ہو، لہٰذا ہندستانی پرچار سبھا نے بھی اکبر کو خراج محبت پیش کرنے کا ارادہ کیا اور اب یہ اکبرالہ آبادی نمبر کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

سبھا کی سرگرمیاں

ہندستانی پرچار سبھا، ممبئی کے زیر اہتمام صد سالہ تقریب، بیادِ اکبر الہ آبادی، ایک روزہ بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد ہوا۔ جس کا موضوع تھا ''ظریف ہند اکبر الہ آبادی''۔ ۳۰ر نومبر، بروز منگل ۲۰۲۱ء، بمقام: مہاتما گاندھی میموریل بلڈنگ، چرنی روڈ (مغرب) ممبئی میں ہونے والے اس سیمینار کی تفصیل اس طرح ہے: افتتاحی اجلاس صبح 10 سے 11 بجے میں، سبھا کے ڈائرکٹر جناب سنجیونگم نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ جناب فیروز این پیچ (ٹرسٹی و اعزازی سکریٹری) نے اپنے افتتاحیہ کلمات سے سیمینار کا آغاز کیا۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر صفی الدین ندوی (آرتھو پیڈک سرجن اور کنسلٹنٹ) نے اکبر الہ آبادی کی شخصیت پر کئی پہلوؤں سے گفتگو کی، سبھا کی جانب سے رسمِ شکریہ اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر احرار احمد (نائب مدیر: ہندستانی زبان) نے ادا کیا۔

پہلے اجلاس صبح 11 سے دوپہر 1 بجے کی صدارت ڈاکٹر عرشیہ جبین (شعبۂ اردو، حیدرآباد یونی ورسٹی، حیدرآباد) نے کی۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاروں اور ان کے موضوع کی تفصیل اس طرح ہے: ڈاکٹر قاضی نوید (اورنگ آباد، مہاراشٹر)، موضوع: اکبر الہ آبادی کی اصلاحی وطنزیہ شاعری۔ بی بی آئیناز جان علی (ماریشس)، موضوع: اکبر الہ آبادی کی شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد (صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی)، موضوع: مغربی علوم وفنون کا حامی اور تہذیبِ مغرب کا مخالف اکبر، اور ڈاکٹر آصف زہری (شعبۂ اردو جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی)، موضوع: مشرقی روایات کے خاموش پاسدار، اکبر۔ اس سیشن کی نظامت بھی ڈاکٹر احرار احمد نے کی۔

ظہرانے کے بعد دوسرے اجلاس: دوپہر 2 سے 4 بجے کی صدارت ڈاکٹر سلیم محی الدین (صدر شعبۂ اردو، شری شیواجی کالج، پربھنی) نے کی۔ مقالہ نگاروں اور ان کے موضوع کی تفصیل اس طرح ہے: ڈاکٹر محمد تابش خان (شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی)، موضوع: اکبر الہ آبادی کا تصور نسواں ''عورت نامہ'' کی روشنی میں۔ ڈاکٹر علی بیات (شعبۂ اردو، طہران یونی ورسٹی، ایران)، موضوع: اکبر الہ آبادی کے فارسی کلام کا تجزیاتی مطالعہ۔ ڈاکٹر سلیم محی الدین، موضوع: اکبر شناسی: چند معروضات (اکبر پر آج تک کی گئی تنقید کے حوالے سے) اور ڈاکٹر عرشیہ جبین (شعبۂ اردو حیدرآباد یونی ورسٹی، حیدرآباد)، موضوع: اردو کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے فروغ میں اکبر کا حصہ۔

اس سیمینار میں طلبہ کے ذریعہ کلامِ اکبر پیش کیا گیا جس کی تفصیل ہے: انصاری جوزی خورشید (مہاراشٹرا کالج، ممبئی)۔ ماریہ محمد انیس چودھری (برہانی کالج، ممبئی) اور ممبئی یونی ورسٹی شعبۂ اردو سے ایم۔فل کی طالبہ خان مدحت شاہ محمد، سید نکہت جبین۔ ایم۔اے سال دوم اور اول کی طالبات میں سے: خان شاہ پروین مجیب، خان گلستاں امرین لیاقت، انصاری آفرین عیناز احمد، مومن آسیہ، انصاری صبیحہ اور شیخ رابعہ نے حصہ لیا۔ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر محمد تابش خان نے ادا کیا۔

ملک کی سینٹرل جیلوں میں قیدیوں کے لیے لائبریریوں کے قیام کے پروجیکٹ کے تحت ہندستانی پرچار سبھا، ممبئی نے ۱۷ر فروری ۲۰۲۲ء کو گوہاٹی سینٹرل جیل، آسام میں لائبریری کا قیام عمل میں لایا۔ جس کا افتتاح آسام کی انسپکٹر جنرل جیل، (آئی جی) محترمہ برنالی شرما اور ہندستانی پرچار سبھا کے ڈائرکٹر اور رسالہ 'ہندستانی زبان' کے مدیر جناب سنجیونگم نے کیا۔ اس موقعے پر آسام کے اعلیٰ پولس عہدیداران اور سبھا کے پروگرام انچارج جناب راکیش کمار ترپاٹھی بھی موجود تھے۔ اسی کے ساتھ اب تک ملک کی ۸۹ر سینٹرل جیلوں میں ہندستانی پرچار سبھا، ممبئی کی جانب سے لائبریری کا قیام عمل میں لایا جاچکا ہے۔

قلم کار متوجہ ہوں

☆ نثری تحریریں جو ہمارے رسالے کے لیے بھیجی جائیں وہ کم سے کم ڈھائی ہزار اور زیادہ سے زیادہ چار ہزار الفاظ پر مشتمل ہوں۔ زیادہ طویل ہونے کی صورت میں حسبِ ضرورت ایڈٹ کرنے کے لیے مدیر حق بجانب ہوگا۔

☆ جو بھی قول یا اقتباس نقل کیے جائیں اس کا مکمل حوالہ لازمی ہے۔ بہت زیادہ اشعار، حوالہ جات اور اقتباس سے گریز کریں۔

☆ ہمارے رسالے میں کتابوں پر تبصرہ نہیں، صرف تذکرہ ہوتا ہے۔

☆ تبصرہ نگاروں سے التماس ہے کہ وہ کسی کتاب پر تبصراتی مضمون کے بجائے تجزیاتی مضمون ارسال کریں جس میں کتاب کی خوبیوں اور کمیوں، دونوں پہلوؤں پر بات کی گئی ہو۔ صرف مدحیہ مضمون قبول نہیں کیا جائے گا۔

☆ شعرا حضرات اپنی دو تخلیق ارسال کریں۔ ایک شاعر کے لیے ایک صفحہ مختص ہے۔

☆ قلم کار کی تحریر یا تخلیق جو کہیں شائع ہو چکی ہو، وہ ہم قبول نہیں کریں گے۔ لہٰذا غیر مطبوعہ ہونے کا تصدیق نامہ بھی ارسال کریں۔ کسی قلم کار کی تحریر اگر پہلے کہیں شائع ہو چکی ہوگی یا کسی سائٹ پر اپ لوڈ کی گئی ہوگی تو ایسی صورت میں اعزازیہ کی رقم روک دی جائے گی اور اس کی کوئی تحریر آئندہ اس رسالے میں شائع نہیں کی جائے گی۔

☆ تحریر کے ساتھ ایک عدد اپنی تصویر، مکمل پتہ، رابطہ نمبر، مختصر تعارف، بینک پاس بک کے اس صفحے کی فوٹو کاپی جس پر آپ کے بینک اور اکاؤنٹ نمبر کی تفصیل ہوتی ہے اور ساتھ میں غیر مطبوعہ ہونے کا تصدیق نامہ، یہ ساری چیزیں ایک ساتھ میل کریں۔

☆ مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں، حقائق، حوالے، املا، جملہ اور ٹائپنگ کی غلطیاں ہونے کی صورت میں اشاعت کی منظوری نہیں دی جائے گی۔

مشرقی تہذیب کا سچا عاشق: اکبرالہ آبادی

ڈاکٹر سیفی سرونجی

نام: سیفی سرونجی۔ پیشہ: درس و تدریس، ۱۹۵۲ء میں سرونج میں پیدا ہوئے تعلیم: ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی۔ اب تک ہزاروں غزلیں، سینکڑوں مضامین، آٹھ شعری مجموعے، دیگر سوانح، سفرنامے، افسانے، انشائیے، ناول، تنقیدی مضامین اور شخصیت پر مشتمل 75 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اہم تصانیف: 'یہ تو سچا قصہ ہے (سوانح)'، 'سرونج سے لندن تک (سفر نامہ)'، 'اردو افسانہ ترقی پسند تحریک کے بعد'، 'نئی غزل نئے امکانات'، 'اکیسویں صدی اور اردو ناول'، 'اردو نظم کا ارتقائی سفر'۔ پانچ مرتبہ لندن کے انٹرنیشنل سیمناروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ دو مرتبہ ساہتیہ اکیڈمی بال پرسکار کے جیوری ممبر رہے، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے بھی ممبر رہ چکے ہیں۔ ۴۰ برسوں سے پابندی کے ساتھ مشہور رسالہ سہ ماہی 'انتساب عالمی' شائع کر رہے ہیں جس کے دو درجن سے زیادہ ضخیم و خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے کئی نمبر ۵۰۰ سے بھی زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں خاص طور پر گوپی چند نارنگ نمبر، ندا فاضلی، بشیر بدر، مظفر حنفی، ظفر گورکھپوری، حامدی کاشمیری، چندر بھان خیال اور دو بیک بدکی نمبر وغیرہ۔ ساتھ ہی ۵ برسوں سے رسالہ ماہنامہ 'عالمی زبان' بھی شائع کر رہے ہیں۔

Email : Saifi.sironji2015@gmail.com Mob : 9425641777

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری جس کا نام کرتی ہے اُس کو عالی مقام کرتی ہے۔ جہاں ایک طرف شاعری دلی جذبات اور احساس کے اظہار کا نام ہے وہیں دوسری طرف شاعری سے کوئی بڑا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ تاریخ اِس بات کی گواہ ہے کہ شاعری نے کئی انقلاب برپا کیے ہیں۔ شاعری بڑے مقصد کے لیے بھی کی جاسکتی ہے۔ اردو شاعری میں دو بڑے شاعر ہوئے ہیں، جنھوں نے شاعری سے ایک انقلاب برپا کیا ہے اور قوم کی اصلاح کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ اُن میں علامہ اقبال اور اکبرالہ آبادی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اکبرالہ آبادی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے طنز و مزاح کے ذریعے قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا ہے، اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا۔

بات سنجیدہ لہجے میں کہی جائے تو دل پر ضرور اثر کرتی ہے، لیکن آدمی خود کا محاسبہ نہیں کر پاتا کہ بڑے بڑے پیغمبروں کو بھی لوگ جھٹلاتے رہے ہیں، لیکن مذاق مذاق میں آدمی کے دل پر جو کچو کے لگائے جاتے ہیں وہ اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں، اور ہر شخص اپنا محاسبہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اکبرالہ آبادی نے اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے یہ ہی احساس دلایا ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک مقصد تھا۔ وہ مغربی تہذیب کے سخت خلاف تھے، اور بے پردگی اور مخلوط تعلیم کے بھی خلاف تھے۔ اُن کے برعکس سرسید احمد خاں نئی تعلیم کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس لیے اکبرالہ آبادی علی گڑھ تحریک کے بھی خلاف تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> "اکبر پہلے شخص تھے جن کو بدلتے ہوئے زمانے، اس زمانے میں اپنے تہذیبی قدروں کے لیے خطرہ، اور انگریزی تعلیم و ترقی کو انگریزی سامراج کے قوت مند شمار ہونے کا احساس شدت سے تھا تو انھوں نے اس کے مضمرات کو بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ اِس معاملے میں گاندھی اور اقبال بھی ان کے بعد ہیں۔ انھوں نے سرمایہ داری اور نو آبادیاتی نظام میں مضمر کئی خطرات کو محسوس کر لیا تھا، وہ رسماً انگریزی کے مخالف نہیں تھے۔"

اکبرالہ آبادی نے مغربی تہذیب وتعلیم کی اتنی شدت سے مخالفت کی کہ بہت سے لوگ اُن سے اختلاف رکھنے لگے۔مغربی تہذیب سے وہ اتنے نالاں تھے کہ انگریزی تعلیم کو بھی اہمیت نہ دی،جبکہ ترقی کا کوئی راستہ انگریزی کے بغیر نہ کل ممکن تھا، نہ آج ممکن ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکبرالہ آبادی کی باتوں کو اور اُن کی شاعری کو بھی لوگ مذاق میں ہی لیتے رہے۔سچ تو یہ ہے کہ مزاحیہ شاعری میں اُن کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ایسے بہت سے شعر اور غزلیں موجود ہیں جن میں کوئی طنز نہیں، بلکہ اُن کے اشعار پڑھ کر لوگ بجائے سنجیدہ ہونے کے لطف اُٹھاتے تھے۔جیسے یہ شعر:

مکّے تک ریل کا سامان ہوا جاتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا جاتا ہے

بیوی کی حکومت لاحول ولاقوت
شوہر کی یہ ذلت لاحول ولاقوت

اکبرالہ آبادی دراصل انگریزوں سے متنفر نہیں تھے، بلکہ وہ اسلامی نظریات کے حامی تھے۔چونکہ انگریز اپنی تہذیب کو زبردستی تھوپ رہے تھے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر فخرالکریم صدیقی لکھتے ہیں:

> "ہندوستان میں جس قسم کا تعلیمی نظام انگریزوں نے رائج کیا اُس کا مقصد ایک ہی تھا، ہندوستان میں حکومت،برطانیہ کے استحکام اور بقا،جس کے لیے تعلیمی ادارے سب سے مفید اور کارگر ہوسکتے تھے۔اس نظام تعلیم نے چند برسوں میں لوگوں کے اذہان بدل کر رکھ لیے۔انگریزی زبان اور مغربی علوم کی اس چکا چوند میں ہمیں خود بصارت پر اعتماد نہ رہا۔ہمارے سوچ وفکر کا دھارا ہی تبدیل ہوگیا۔۱۸۳۵ء میں ہی لارڈ میکالے نے ہندوستانیوں کے لیے ایک نیا نظامِ تعلیم مرتب کیا،اور انگریزی زبان کو نہ صرف ذریعۂ تعلیم بلکہ عوامی رابطے کی زبان بنانے کی تجویز پیش کی۔اُس کا مقصد ملک میں ایسا گروہ پیدا کرنا تھا جو انگریزی تہذیب ومعاشرت کی تقلید کرے۔"

انگریز چونکہ اُس وقت پورے ملک میں اپنا تسلط قائم کر چکے تھے۔ہر طرف ظلم وستم اور انتشار پھیلا ہوا تھا۔اکبرالہ آبادی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔بھلا ایک خوددار شاعر اپنی تہذیب کی دھجیاں اُڑتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا؟اکبر نے اپنی شاعری سے مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں احتجاج بلند کیا۔کئی نظمیں اور اشعار موجود ہیں جس میں اُنھوں نے مغربی تہذیب کا مذاق بھی اڑایا ہے،اپنی قوم کو بیدار بھی کیا اور احساس بھی دلایا ہے۔انگریز تعلیمی اداروں سے لے کر دیگر دفتروں اور جلسوں، مذاکروں کے ذریعے عیسائیت کو فروغ دینے میں کوشاں تھے۔اکبرالہ آبادی کو اسلام خطرے میں نظر آیا، کیونکہ لوگ جوق در جوق مغربی تہذیب میں ڈوبتے جارہے تھے۔اکبرالہ آبادی نے اِس بڑھتے ہوئے رجحان اور مغربی تہذیب کے شیدائیوں سے، ملک کے نوجوانوں سے یوں خطاب کیا:

خدا کے واسطے اے نوجوانوں ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگادو جوش میں آؤ

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا نسبت

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بُری ہیں اُن سے پرہیز کرو

نئی تہذیب نئی راہ رنگ جہاں
دور گردوں کی کوئی کرتا کہاں تک تردید

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

اکبرالہ آبادی نے عورتوں کی تعلیم کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اسکولی تعلیم میں لڑکے لڑکیوں کا ساتھ پڑھنا اُن کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ اُنھیں خطرہ تھا کہ اِس سے عیاشیاں بڑھیں گی، بے شرمی، بے حیائی کا چلن عام ہو جائے گا، عورت کی عزت محفوظ نہ رہ سکے گی۔ اس لیے انھوں نے مخلوط تعلیم کو نشانہ بنایا:

اپنی اسکولی بہو پر ناز ہے اُن کو بہت
ہال میں ناچے گی کسی دن اُن کی پوتی تو سہی
گھر سے پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
باہنر باعلم خوش اور ساختہ پر داختہ
مغربی تہذیب آگے بڑھ کے جو حالت دکھائے
نوجواں دکھلائی دیں گے ہر طرف دِل باختہ
مغربی شاخ فقط ہے تیری قومی ہستی
یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا

اکبرالہ آبادی نے ایسے ایسے نامانوس الفاظ سے مزاح کی چاشنی پیدا کی ہے کہ کوئی دوسرا اُن کا ہمسر نہیں ہے۔ مثلاً ٹٹو، اونٹ، بھینس، گائے، ریل گاڑی، بدّھو جیسے الفاظ سے ظرافت کے کئی رنگ بھر دیے ہیں۔ جتنا اکبرالہ آبادی نے مغربی تہذیب کا مذاق اُڑایا ہے، اُتنا کسی نے نہیں اُڑایا۔ اکبرالہ آبادی کے نظریات اور خیالات سے اکثر لوگ متفق نہیں تھے، اس لیے کہ وہ تعلیم نسواں کو عیب سمجھتے تھے، جبکہ وہ اسلامی نظریات کے حامی تھے۔ اسلام نے عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دیا ہے۔ اکبرالہ آبادی کے مخالفین کی تعداد کافی تھی، حالانکہ وہ ایک سچے مسلمان تھے، اور ایمان کی سلامتی کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نئی روشنی، نئے فیشن اور اسلام بیزار مغربی تہذیب کو طنز کا نشانہ بناتے تھے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ہندوستان و پاکستان کے نقاد اِس حد تک تو متفق نظر آتے ہیں کہ اکبر مشاہدے کی قوت تھے۔ شاعرانہ انداز میں اُنھوں نے اپنے زمانے کی معاشرت کی نہایت دیانتداری سے ترجمانی کی ہے۔ اُن کے کلام میں مسلمانِ ہند کی اخلاقی قدروں، حکومت کی چیرہ دستیوں، قومی پریشانیوں، تہذیبی انحطاط اور قدیم و جدید کی کشمکش کی واضح تصویریں ملتی ہیں، اور اِس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکبر کی شاعری میں اُس زمانے کی روح پوری طرح کھچ آئی ہے، اور اُس کے نقش و نگار اتنے روشن ہیں کہ اکبر کی شاعری کی تاریخی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔''

سچ بات تو یہ ہے کہ اکبرالہ آبادی نے اُس عہد کی آنکھوں دیکھی جھلکیاں طنز و مزاح کے انداز میں پیش کر کے مشرقی تہذیب کے ایک سچے عاشق کا رول ادا کیا ہے۔ یاس یگانہ نے تو اکبر کی شاعری کو غالب کی شاعری سے برتر قرار دیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ اکبر کی نظر قوم کی میراث بھی تھی، اور قوم کی تقدیر بھی۔ آخر میں اپنی بات اکبر کے اِس شعر پر ختم کرتا ہوں:

شعرِ اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری نہ ہو جو ایسی کوئی بات نہیں

☆☆☆

اکبر شناسی : چند معروضات

ڈاکٹر سلیم محی الدین

نام: سلیم محی الدین، پیشہ: درس وتدریس (صدر شعبۂ اردو، شری شیواجی کالج، پربھنی۔ مہاراشٹر)۔ تصانیف: "وابستہ"، شعری مجموعہ ۱۹۹۸ء۔ "مراٹھواڑہ میں اردو غزل"، تحقیق وتنقید ۲۰۱۳ء۔ "میزان"، تنقیدی مضامین۔ "مضمون تازہ"، تنقیدی مضامین، ۲۰۱۶ء۔ "آئندہ"، شعری مجموعہ، زیر ترتیب۔ ایوارڈس: ساحر لدھیانوی ایوارڈ، ۱۹۹۹ء۔ ۲۰۰۰ء۔ اردو ساہتیہ اکادمی ممبئی۔ منتخب کتاب ایوارڈ، ۲۰۱۶ء۔ اردو ساہتیہ اکادمی ممبئی۔ آپ کا شمار مہاراشٹر کے معتبر شعرا میں ہوتا ہے۔ پربھنی میں اردو کے فروغ میں آپ کی خدمات قابل ستائش ہیں۔

Email : saleempbn@gmail.com / MOb : 9923042739

لسان العصر اکبر الہ آبادی اردو شعر وادب کا ایک ایسا ہاتھی ہے جس کے جو جز دلگا اس نے اُسی کو اکبر کُل سمجھ لیا۔ ظریف ہند کے ساتھ یہ ستم ظریفی ہوتی رہی، ہو رہی ہے اور ان شاء اللہ ہوتے رہے گی۔ اس کی وجہ خود اکبر ہیں کیونکہ ان کی شاعری محض ظریفانہ نہیں تھی۔ ان کی فکری انتہا پسندی اظہر من الشمس ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ناقدین اور مداحین دونوں بھی اپنے اپنے موقف میں انتہا پسند نظر آتے ہیں اور حیرت انگیز طور پر اس معاملے میں فریق کا موقف یہی ہوتا ہے کہ:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اکبر الہ آبادی تاریخ کے اس موڑ پر منصۂ شہود پر آتے ہیں جہاں تہذیبی کشاکش اپنے عروج پر ہے، سیاسی بیانیہ اور معاش سروکار تغیر پذیر ہیں، سات سمندر پار کا صنعتی انقلاب دروازے پر کھڑا دستک دے رہا ہے۔ اس بن بلائے مہمان کا استقبال کس طرح کیا جائے؟ یہ تو پوری قوم کے اجتماعی شعور کے لئے ایک چیلنج تھا۔ اردو کا ایک شاعر اس چیلنج کو اپنے انداز میں قبول کرتا ہے۔ اپنی تمام تر ذاتی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے ساتھ جب وہ اپنے قلم کو تلوار بناتا ہے تو کوئی اسے لسان العصر تو کوئی ظریف ہند سے موسوم کرتا ہے:

روشنی سر میں ، گداز غم ، دلِ مایوس میں
شمع سا ہم جل رہے ہیں مغربی فانوس میں

اکبر کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں محض چودہ سال کی عمر ہی سے تلاش معاش کرنی پڑی اور ان کا عرصۂ ملازمت بھی زیادہ خوش گوار نہیں رہا۔ انھیں 23/سالہ دور ملازمت میں 25/مرتبہ تبادلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وجوہات چاہے کچھ رہی ہوں۔ اکبر نے کبھی اس پر کھل کر بات نہیں کی لیکن گمان اغلب یہی ہے کہ ان کی شاعرانہ ظرافت ہی اس کا سبب رہی ہوگی۔ کیونکہ مغربی فانوس کی علامت کو سمجھنے والے ان کے ارباب مجاز میں موجود تھے۔ اکبر شروع ہی سے

'اودھ پنچ' کے صفحات پر نثر و نظم کے ذریعہ اپنی فکر کا اظہار کرتے رہے اور اسی باعث مقبول خاص و عام بھی رہے۔ بطور شاعر اکبرالہ آبادی فارسی و اردو شعری روایات کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ زبان و بیان، روزمرہ اور محاروے پر قدرت اشعار کی سلاست وروانی قلندرانہ بانکپن اور ساتھ ہی حسن تغزل ان کی ابتدائی شاعری میں صاف جھلکتا ہے۔ ان کے اسلوب اور لہجے کی اٹھان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو غزل کو ایک نیا مزاج داں نصیب ہوگیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

سمجھ میں صاف آجائے فصاحت اس کو کہتے ہیں
اثر ہو سننے والوں پر بلاغت اس کو کہتے ہیں

اک عکس نا تمام پہ عالم کو وجد ہے
کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا

دیکھے ہیں بہت جلوۂ مستانہ کسی کا
یاں کعبۂ مقصود ہے دیوانہ کسی کا

تمھی سے ہوئی مجھ کو الفت کچھ ایسی
نہ تھی ورنہ میری طبیعت کچھ ایسی

دوں گا ذرا سمجھ کے جواب ان کی بات کا
رخ دیکھتا ہوں سلسلۂ واقعات کا

اردو غزل کا ایسا سنجیدہ اور طرحدار شاعر کیسے اچانک طنز و ظرافت کی جانب مائل ہوا اور پھر اسی کا ہو رہا۔ یہاں تک کہ ظریف ہند کہلایا۔ کیا یہ اکبر شناسی کا دعوی رکھنے والوں کے لئے سوالیہ نشان نہیں ہے۔ کیا اکبر کی شاعری طنز و ظرافت محض سرسید اور ان کے تعلیمی نظریات کو نشانہ بنانے کی غرض سے تھی۔ یا صرف مغربی تہذیب اور مغربی علوم کی مخالفت ہی اس کا مقصد تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو خود اکبر کانٹ ہیگل، اسپنسر، مل، اور ہکسلے کا مطالعہ کیوں کرتے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے ولفریڈ سکاون بلنٹ کی تصنیف 'فیوچر آف اسلام' کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔[2] بے شک اکبر مغرب کے نظریات اور اس کے مرعوبین کے مخالف تھے لیکن یہ مخالفت برائے مخالفت نہیں تھی۔ بلکہ یہ ایک شعوری اور فکری عمل تھا۔ اکبر مغربی ترقیات کے قائل ضرور تھے لیکن وہ بھارت میں ان کے نفاذ کے طریقۂ کار کے مخالف تھے۔ وہ ملکی حالات سے اٹھ کر عالمی سیاسی صورتحال سے بھی بخوبی واقف تھے:

اس کا پیچنا ہے اور اس کے ہیں بھپارے
یورپ نے ایشیا کو انجن پہ رکھ لیا ہے

اس مقام پر ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اکبرالہ آبادی اردو شاعری میں علامتوں کا استعمال کرنے والا پہلا شاعر ہے۔ ریل، انجن، پائپ، ٹائپ، توپ، لیمپ، کیمپ، کالج، یونیورسٹی، اخبار، پانیر اور ایسے بے شمار الفاظ کا استعمال علامت کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس طرح کے بے شمار علامتوں اور اشعاروں کی مدد سے اکبرالہ آبادی نے نہ صرف مغربی تہذیب بلکہ نوآبادیاتی نظام پر بھی شدید تنقید کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ راست بیانی سے بھی نہیں چوکے کیونکہ انھیں تو گفتگو عوام سے تھی:

یورپ میں گو ہے جنگ کی قوت بڑھی ہوئی
لیکن فزوں ہے اس سے تجارت بڑھی ہوئی
ممکن نہیں لگا سکیں وہ توپ ہر جگہ
دیکھو مگر پیرس کا ہے سوپ ہر جگہ

آیئے اک نظر اکبر کے ناقدین پر بھی ڈالتے ہیں۔آل احمد سرور کے نزدیک اکبر طرز کہن پہ اڑنے والے اور آئین نو سے ڈرنے والے تھے:

''دراصل وہ مصور تھے مفکر نہیں تھے۔اپنے زمانے کی تصویر کھینچ لیتے تھے۔اپنے زمانے سے آگے دیکھنا انہیں نہیں آتا تھا۔احساس کی دولت سے مالا مال تھے۔فکر کی روشنی کم تھی۔حال کو ماضی کے معیار پر پرکھتے تھے اور مستقبل کے خیال سے ڈرتے تھے۔خلوص تھا۔نظر نہ تھی۔'' ۳

سید احتشام حسین کے مطابق سرسید ایک نئی دنیا کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن اکبر اس کو محض وقتی ہنگامہ آرائی سمجھتے تھے۔اس لئے انھوں نے مغرب سے آئی ہر چیز کی پائپ، ٹائپ، ٹم ٹم، بائسکل اور انجن تک کی مخالفت کی۔یعنی مغربی علوم اور سائنس کی مخالفت کرتے ہوئے اکبر نے ہندوستان کی معاشی ترقی اور نئے سیاسی شعور کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۴

شیخ محمد اکرام کے مطابق اکبر طنزیہ و ظریفانہ شاعری میں تو بے مثل ہیں مگر بطور مفکر وہ حالی اور اقبال کے ہم پلہ نہیں۔انھیں نئے زمانے اور نئی نسل کا درک نہیں تھا۔۵ جبکہ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی نے تو اکبر کو انگریزوں کا قصیدہ خواں تک کہہ دیا۔حیرت انگیز طور پر کلیم الدین احمد جو اپنے تلخ و ترش تبصروں کے لئے معروف ہیں۔اکبر الہ آبادی کے متعلق کہتے ہیں کہ:

''وہ ترقی کے خلاف نہیں تھے۔ترقی کی طرف قدم اٹھے اور ضرور اٹھے لیکن ذرا سوچ کر۔نئی چیزیں اچھی ہیں، پرانی چیزیں بری ہیں یہ نقطۂ نظر عام ہو چلا تھا۔وہ (اکبر) اس بے عقلی کے خلاف تھے۔'' ۶

جبکہ حسن عسکری اکبر الہ آبادی کو اردو کا جدید ترین شاعر اس بنیاد پر قرار دیتے ہیں کہ اکبر نے نئے نشانوں کو علامتوں کا درجہ دیا۔عہد حاضر کے اہم نقاد شمس الرحمن فاروقی اکبر کو ایک قوم پرست اور روادار شاعر قرار دیتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ اکبر پہلے ہندوستانی شاعر ہیں جنہیں اس بات کا احساس تھا کہ سامراجی نو آبادیاتی نظام کے مقدور ہتھکنڈوں میں تعلیم بھی ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔وہ اکبر کی شاعری میں علامتوں کے استعمال کی خوبصورت تشریح کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

ممنون تو میں ہوں ترا اے سایۂ شجر
سر پر مگر عذاب ہے چڑیوں کی بیٹ کا

چڑیوں کی بیٹ سے مراد وہ ذلت ہے جو نو آبادیاتی حاکم کے ہاتھوں محکوم قوم کو ہر لمحہ پہنچتی رہتی ہے۔آج کل ہر طرف عالم کاری (Globalization) اور سرمائے کے پھیلاؤ کو مغربی قوتوں کی نئی استعاری حکمت عملی اور صارفیت کی مقبولیت کو بھی سرمایہ دار طاقتوں کا ایک حربہ کہنے کا رواج ہے اور یہ باتیں صحیح بھی ہیں۔لیکن اکبر کے وقت

میں نہ صارفیت تھی نہ عالم کاری اور نہ وہ کارل مارکس کے اس قول سے واقف تھے کہ سرمایہ داری کا انتہائی مقصود یہ ہے کہ تمام دنیا ایک بازار میں تبدیل ہوجائے۔ اس کے باوجود اکبر کی چشم جہاں بیں نے یہ باتیں دیکھ لی تھیں یے۔اردو کے ایک اہم نقاد فضیل جعفری کے مطابق:

> ''اکبر کی شاعری بظاہر تو بڑی آسان اور سادہ معلوم ہوتی ہے مگر ان کا شعری عمل (Process) خاصا پیچیدہ اور بہت تہہ دار ہے۔ وہ مشرق کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے علم بردار ہیں۔ ان کے یہاں جا بجا ایسی آفاقی صداقتیں بکھری ہوئی ہیں جو اکبرالہ آبادی کو ہر دور میں زندہ رکھیں گی ۔ہاں انھیں سمجھنے اور پرکھنے کے زاویے بدلتے رہیں گے۔ اکبر نے زباں و بیان کے جو تجربے کئے ہیں ان پر بھی سنجیدگی اور غور کے ساتھ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔'' ۸

مداحین اکبر میں ایک نام علامہ اقبال کا بھی آتا ہے جو اکبر کو اسلامی ادیبوں میں بے مثال نکتہ رس ہستی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیاء میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ زمانہ سینکڑوں سال گردش کرتا رہتا ہے جب اسے اکبر ہاتھ آتا ہے۔'' ۹

مداحین اکبر میں عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی اور ماہر القادری بھی شامل ہیں۔ اکبر کو روایت پرست، رجعت پسند اور ماضی پرست کہنے سے قبل ہمیں ان کی فکر اور ان کے پیغام کو بخوبی سمجھنا ہوگا۔ اکبر کا قصور یہی ہے کہ وہ اپنی فکر کے اظہار میں شدت پسند ہیں۔ ان کے احتجاج کی لے اس قدر تیز ہوتی ہے تو یہ ان کی مخالفت کو اجاگر کر دیتی ہے لیکن ان کا مثبت پیغام ہمارے پیچھے چھوٹ جاتا ہے۔ اکبر شناسی کے ذیل میں فکر اکبر کے ان مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ میں اپنی بات اکبر کے ملک کے نوجوانوں سے خطاب کے ایک مثبت پیغام پر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ:

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے، اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو، علومِ بحر و بر سیکھو

حواشی:

(۱) طالب الہ بادی: 'اکبرالہ بادی' ص۔36
(۲) طالب الہ بادی: 'مکاتب اکبر' بنام عبدالماجد دریابادی۔ ص۔75
(۳) آل احمد سرور: نئے اور پرانے چراغ۔ ص 242
(۴) علی گڑھ میگزین: اکبر نمبر۔ ص 131
(۵) شیخ محمد اکرام: موج کوثر۔ ص 218
(۶) کلیم الدین احمد: اردو شاعری پر ایک نظر۔ ص۔58
(۷) شمس الرحمن فاروقی: صورو معنی سخن۔ ص 191
(۸) فکر و تحقیق: اکبرالہ بادی نمبر۔ ص 53
(۹) فکر و تحقیق: اکبرالہ بادی نمبر۔ ص 186

☆☆☆

اردو کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں اکبرالہ آبادی کا حصہ

ڈاکٹر عرشیہ جبین

ڈاکٹر عرشیہ جبین، اسوسیٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد۔ آپ کی دل چسپی کے میدان تنقید، شاعری، جدید نثر اور صحافت ہیں۔ تصانیف: ''شارب ردولوی: شخصیت اور تنقید نگاری''، ۲۰۰۵ء۔ ''تہنیت النسا تہنیت: شخصیت اور نعت گوئی''، ۲۰۰۹ء۔ ''فکری زاویے''، ۲۰۱۲ء۔ ''روشن زاویے''، ۲۰۱۳ء۔ آپ کی علمی وادبی خدمات کے مدنظر تلنگانا اسٹیٹ اردو اکیڈمی نے ۱۶۔۲۰۱۵ء میں بیسٹ ٹیچر کے ایوارڈ سے نوازا۔ آپ ایک اچھی مبصر اور کئی اداروں اور انجمنوں کی رکن بھی ہیں۔ کئی سیمنار کی صدارت کر چکی ہیں۔ ملک اور بیرونِ ملک کے موقر رسالوں میں اکثر محترمہ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

Email : arsshizee61@gmail.com

اکبرالہ آبادی اردو ادب میں اپنی منفرد شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے طنزیہ ومزاحیہ شعرا میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کی ولادت ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آباد ضلع کے ایک گاؤں بارہ میں ہوئی۔ ان کی تعلیم گو کہ مشرقی طرز پر ہوئی لیکن انھوں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے انگریزی زبان میں بھی اچھی لیاقت حاصل کر لی۔ پھر عدالت سے وابستہ ہو کر ملازمت کا آغاز کیا پھر وکالت بھی کی اور سشن جج کے عہدے پر فائز بھی ہوئے۔ اکبر کی زندگی گو کہ رنگین رہی لیکن انھوں نے مذہب اور مشرقی روایات سے اپنے آپ کو الگ نہیں کیا۔ ان کے عہد کے حالات خصوصاً غدر کے بعد کے حالات، تحریک عدم تعاون اور تحریک آزادی کے اثرات کا ان کے ذہن پر گہرا اثر رہا۔ انگریزی ملازمت کے دوران انھیں انگریزی حکام اور ان کے اطراف واکناف کے ماحول اور ان کی طرز زندگی سے گہری واقفیت حاصل ہوئی اور وہ مغربی حکومت کی سازشوں اور پالیسیوں سے باخبر ہوئے۔ وہ مغربی تہذیب کے منفی اثرات سے قوم کو بچانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاحیات اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ذریعے مشرقی تہذیب کی پیروی کرتے اور اپنی قوم کو مغربی تہذیب کی خامیوں سے آگاہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانہ جاہ و حشم ہوں گے

اکبر کی شاعری اپنے عہد کا آئینہ ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے ہندستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے اور ان میں در آئی خامیوں کو آئینہ دکھا کر ان کی اصلاح کرتے نظر آتے ہیں۔ اکبر کے عہد میں جس طرح کی شاعری ہو رہی تھی۔ اس میں زیادہ تر واعظ، محتسب، رقیب یا عاشق ومعشوق ہی اکثر طنز ومزاح کا نشانہ بنتے نظر

آتے ہیں اور اس عہد میں طنز و مزاح کی جگہ ہجو گوئی کا رواج عام تھا جہاں ذاتی اختلافات اور بغض وعناد کا دخل زیادہ ہوتا تھا لیکن اکبر نے ہجو گوئی کی جگہ ایسے طنزیہ و مزاحیہ انداز کو اختیار کیا جس میں ان کی فکری و ذہنی صلاحیتوں کا بڑا دخل ہے۔ انھوں نے اپنے تخیل اور شاعرانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے شاعر کی ذاتی اور محدود دنیا سے ہٹ کر پورے معاشرے اور سماج کی خرابیوں اور خامیوں کو ہدف ملامت بنایا۔ بڑی سنجیدگی، شائستگی اور مفکرانہ لہجے میں قوم کی اصلاح کی کوشش کی۔ جس میں کسی کی تضحیک اور مذاق اڑانا مقصود نہیں تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

مرکزِ دل بزمِ مشرق میں کوئی ملتا نہیں
ہر طبیعت مغربی چکر میں ہے آئی ہوئی

وہ گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی، وہ عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی
وہ حسینوں میں رنگِ وفا نہ رہا، کہیں اور کی کیا، وہ ہمیں نہ رہے

نہ کوئی تکریم باہمی ہے، نہ پیار باقی ہے اب دلوں میں
یہ صرف تحریر میں ڈیئر سر ہے یا جناب مکرم

ڈاکٹر سید اعجاز حسین اکبر کی شاعری کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اکبر نے اپنے شعور یا محسوسات کو جس عنوان سے پیش کیا وہ اردو میں اس سے پہلے نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس سے پہلے کی تمام شاعری کا جائزہ لے لیجیے تو بھی یہی معلوم ہوگا کہ ظریفانہ شاعری ہجو کے علاوہ کسی اور شکل میں کسی خاص اہمیت کے ساتھ نہیں ملتی۔ غزل، قصیدہ، وغیرہ میں بھولے بھٹکے مزاح تمسخر یا پھبتی وغیرہ کا کوئی جزو کہیں مل جاتا ہے مگر وہ تو تسلسل کے ساتھ ملتا ہے اور نہ اس لطافت کے ساتھ جو اکبر نے پیش کیا ہے۔۔۔ وہ ظرافت کو ایک خاص اہمیت اور روک تھام کے پیش کرنا چاہتے تھے کیوں کہ محض تفریحات کے خانہ میں نہیں ڈال دینا چاہتے تھے بلکہ کسی خاص مقصد براری کا آلہ کار بنانا چاہتے تھے۔"

(سید اعجاز حسین، اکبر فنکار کی حیثیت سے، علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، ۱۹۵۰، ص ۵)

اکبر کے عہد میں خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے بڑی تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ انگریزی قوم سے مقابلہ کے لیے ہندوستانی بھی انگریزی علوم اور انگریزی تہذیب کو اپنا کر ترقی کی راہ پر گامزن تھے۔ شعر و ادب میں بھی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ نئی نئی اصناف و اسالیب کے ذریعے شعرا و ادبا سماج و معاشرے کی اصلاح کی کوششیں کر رہے تھے۔ سرسید اور ان کے رفقا کے نقطۂ نظر سے اختلاف کے باوجود اکبر کی شاعری پر بھی اس عہد کی تبدیلیوں کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح کو ہتھیار بنا کر قوم و معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی۔ زندگی اور سماج کی خامیوں کی اصلاح ہی ان کی زندگی کا عین مقصد تھا۔ کیوں کہ انگریزی حکومت نے ہندوستان کی اقتصادی حالت کو درہم برہم کر دیا تھا یہاں سے خام مال نہایت سستے دام میں انگلستان جاتا تھا اور وہاں سے تیار ہو کر یہاں مہنگے داموں میں فروخت ہوتا تھا یہاں کے کسانوں کی حالت بھی بہت خستہ حالی کا شکار تھی۔ یہاں کی اندرونی تجارت پر بھی دھیرے دھیرے انگریز قابض ہو گئے تھے۔ ان حالات میں ہندوستانی معیشت مکمل طور پر انگریزوں کے قبضے میں آ گئی تھی اور ہندوستانیوں پر انگریزوں کا رعب و دبدبہ قائم ہو گیا۔ انگریزی حکومت کا استحصال اور ظلم و ستم اس قدر تھا کہ زبان کھولنے سے بھی ہندوستانی خوف کھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے شعرا اپنی شاعری میں علامتوں کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اکبر نے بھی انگریزی حکومت اور ملکی سیاسی حالت کو علامتوں کے ذریعے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

تمہارے کھیت سے لے جاتے ہیں بندر چنے کیونکر
یہ بحث اچھی ہے اس سے حضرت آدم بنے کیونکر

جیب سے مفروری زر بے تحاشہ دیکھیے
جلوۂ بازار مغرب کا تماشا دیکھیے

علم یورپ کا ہوا میداں وسیع
رزق میں ہندی کے تنگی ہوگئی

اکبر نے اپنے عہد کے سیاسی اور معاشی صورتحال سے بے چین تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی و سیاسی اور معاشی حالات پر طنز کے ذریعے چوٹ کرکے انسانی زندگی میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین اکبر کی شاعری کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس وقت سے اکبر نے ظرافت کے میدان میں قدم رکھا شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو احساس تھا کہ ادب نام ہے حیات کی ترجمانی کا اور دائرہ حیات میں سماج سیاست، معاشرت سب ہی آتے ہیں ان پر اظہار خیال شاعرانہ انداز میں نہ کرنا ادبی گناہ بھی ہے اور تنگ نظری بھی اور خود غرضی کا ثبوت بھی۔

چنانچہ انھوں نے اپنے وقت کی ہر اس تحریک سے دلچسپی لی جو حیات عامہ سے متعلق تھی اور اپنے طور پر جو رویہ غلط سمجھے اس سے لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لیے اپنی شاعری کو آلۂ کار بنایا۔اس سے پہلے بھی اردو شعرا اس ضمن میں اپنی سی کوشش کر چکے تھے لیکن ان کی چیخ پکار کا وہ اثر نہ ہو سکا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔اکبر کو ایک نیا راستہ نکالنا تھا تاکہ عام و خاص دونوں اثر لیں اور بیکاری سے بیداری کا رخ کریں۔ان کی سوجھ بوجھ اور ذہانت نے ایک نیا راستہ نکال ہی لیا۔''

(سید اعجاز حسین، اکبر فنکار کی حیثیت سے، علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، ۱۹۵۰ء، ص ۱۱)

دراصل اکبر مغربی تہذیب کے اپنی قوم پر پڑنے والے مضر اثرات کے مخالف تھے۔انگریزی تعلیم اور تہذیب سے انھیں کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ انگریزی تہذیب کے برے پہلوؤں اور اس کی وجہ سے ہمارے اخلاق و کردار پر پڑنے والے غلط اثرات سے اکبر کو شکایت تھی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مغربی اثرات کے تحت ہمارے کردار و اقدار میں ہونے والی تبدیلیوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔اکبر کی شاعری پر بعض ناقدین نے اعتراضات کئے کہ اکبر نے نئی نسل اور مغربی تہذیب کے صرف منفی پہلوؤں پر نظر رکھی مثبت پہلوؤں کو نظر میں نہیں رکھا ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر محمد زکریہ لکھتے ہیں:

''اکبر پہلے تخریب کے قائل ہیں تو اس وجہ سے کہ انکے دور میں بہت سے مخرب رجحانات پیدا ہو گئے تھے جن پر وار کرنے سے پہلے کسی مثبت فکر کی تبلیغ موثر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ مخرب رجحانات تھے کورانہ انداز میں مغربی تہذیب و تمدن کی پیروی کرنا مغرب کی ہر بات کو برتر سمجھنا اور مشرق کی ہر چیز کو ادنیٰ اور پست قرار دینا۔مغربی سائنس اور فلسفے کی ہر چیز کو حرف آخر تسلیم کرنا اور مذہب کو اس کے تابع بنانا۔جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں کو مغرب نے اس حد تک تسخیر کر لیا تھا کہ وہ مغرب کی ہر چال کو اپنے مفاد میں تصور کرتے تھے۔سیاسی غلامی سے بڑھ کر ذہنی غلامی کا آغاز ہو چکا تھا اور جب ذہنی غلامی قبول کر لی جاتی ہے تو پھر نجات کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔اکبر کا عہد مغرب سے ہمہ جہتی مرعوبیت کا دور تھا''۔

(ڈاکٹر محمد زکریا، اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۰)

ہندوستانی عوام کی مغرب سے اس قدر مرعوبیت کی وجہ سے سماج و معاشرے میں بے شمار عیب در آئے تھے یہی وجہ ہے کہ اکبر اپنی شاعری

میں طنز کی کاٹ سے مغرب سے مرعوب قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً چند مثالیں دیکھیے:

نئی تہذیب میں وقت زیادہ تو نہیں ہوتی
مذاہب رہتے ہیں قائم میرا ایمان جاتا ہے
زوال جاہ و دولت میں بس اتنی بات اچھی ہے
کہ دنیا میں بخوبی آدمی پہچان جاتا ہے

آفیشل اعمال نامہ کی نہ ہوگی کچھ سند
حشر میں تو نامۂ اعمال دیکھا جائے گا

ولولے لیکے نکلنے لگے کالج کے جوان
شرم مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرم جوشی کی
کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشی کی
دلیلیں فلسفہ کو نورِ باطن کر نہیں سکتیں
کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں
چُھپانے کے عوض چَھپوا رہے ہیں خود وہ عیب اپنے
نصیحت کیا کروں میں قوم کو اب عیب پوشی کی

اکبر نے جہاں انگریزی تہذیب سے متاثر اپنی قوم کو نشانۂ طنز بنایا وہیں مغربی اشیا کے استعمال کرنے والوں پر بھی چوٹ کی ہے اور اس کے نقائص بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً:

امید چشمِ مروّت کہاں رہتی ہے باقی
ذریعہ باتوں کا جب صرف ٹیلیفون ہوا

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

آپ کے درشن مصور کے بھی حصے میں نہیں
بس لیا جاتا ہے فوٹو ہی سے فوٹو آپ کا

کیوں کرنے لگے وہ مجھ گدا سے باتیں
زوروں پہ ہیں کرتے ہیں ہوا سے باتیں
میں سجدہ میں کہہ رہا ہوں سبحان اللہ
بیلون میں وہ کریں خدا سے باتیں

اکثر طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں شاعر مختلف کرداروں کو ہدفِ ملامت بنا کر بھی قوم کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ اکبر نے مذہب، تہذیب، ثقافت، اخلاق اور تمدن میں پیدا شدہ خامیوں کو دور کرنے کے لیے مختلف طبقات کی نمائندگی کرنے والے اہم کرداروں کو طنز کا نشانہ بنا کر ان کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ مثلاً مذہبی کرداروں میں شیخ، واعظ، مولوی، زاہد، برہمن اور پنڈت اہمیت رکھتے ہیں، جن کو انھوں نے نشانۂ طنز بنایا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

شیخ کو وجد میں لائی ہیں پیانو کی گتیں
پیچ دستارِ فضیلت کے کھلے جاتے ہیں

ہیں غش میں شیخ دیکھ کے حسن مس فرنگ
بچ بھی گئے تو ہوش انہیں آئے گا دیر میں

آز و دولت میں خود واعظ ہیں غرق
دوسروں پہ نکتہ چینی کی تو کیا!

مے خانۂ رفارم کی چکنی زمین پر
واعظ کا خاندان بھی آخر پھسل گیا

مجھ کو حیرت ہے یہ کس پیچ میں آیا زاہد
دامِ ہستی میں پھنسا زلف کا سودا نہ ہوا

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں
موافق اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں

خالی حرم کو شیخ ہی تنہا نہ کر گئے
حیرت میں بت بھی ہیں کہ برہمن کدھر گئے

ان شخصیات کے علاوہ اکبر نے نچلے طبقے کے نمائندہ کرداروں کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ چند مثالیں نچلے طبقے کے کرداروں سے متعلق اس طرح ہیں:

حکم انگلش کا ملک ہندو کا
اب خدا ہی حافظ ہے بھائی صلّو کا

فرما گئے ہیں بھائی گھورن
دنیا روٹی ہے اور مذہب چورن

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے
کونسل میں بہت سید، مسجد میں بہت جمن

متوسط طبقے کے کرداروں کو بھی نہیں بخشا کیوں کہ متوسط طبقے میں بھی اس عہد میں کئی خرابیاں آ گئی تھیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو انگریزی تہذیب کو اپنا فیشن سمجھنے لگے تھے اور بے جا مغرب پرستی کی وجہ سے یہ طبقہ پستی کا شکار ہو رہا تھا۔ ان کرداروں میں لالہ، بابو صاحب اور مہنت صاحب وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک دو مثالیں دیکھیے:

کیا تعجب ہے دیا جو ووٹ لالہ کے لیے
بت تو تھے ہی مرے معشوق برہمن بھی سہی

پارک میں کیا جاؤں ہے وقتِ نماز
بابو صاحب کو ٹہلنے دیجیے

کیا خوب پڑھ رہے تھے مصرعے مہنت صاحب
بھنڈار تو ہے خالی، بھاری مگر بھرم ہے

اعلیٰ طبقے کے افراد میں اکبر نے انگریز، صاحب، لاٹ صاحب، گورنر اور سیٹھ جی کو نشانہ طنز بنا کر ان کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:

کیوں نہ ہو اپنے دل کو ان سے ملاپ
لاٹ صاحب ہیں ہمارے مائی باپ

عہد دیتے ہیں، سند دیتے ہیں، زر دیتے ہیں
خان ساماں وہ مجاہد کو بھی کر دیتے ہیں

نہ صاحب کو مارو نہ صاحب سے بھاگو
مچاتے رہو غل، پٹو اور مانگو

سیٹھ صاحب کے یہاں شادی ہے، رندوں کو نوید
اچھے اچھے طائفے ہیں شہر میں آئے ہوئے

اکبر نے ان کرداروں کے علاوہ اس عہد کی بعض نامور شخصیات کو بھی نشانہ تنقید بنایا ہے۔ مثلاً شبلی، سرسید، محمد علی، لالہ لاجپت رائے اور گاندھی جی کو بھی انھوں نے نظریاتی اختلافات کے باعث طنز کا نشانہ بنایا۔ اس کے علاوہ میاں، بیوی، بیگم، نوجواں، پولس، سول سرجن، لیڈر، صحافی اور مس وغیرہ کو بھی انھوں نے مغربی تہذیب کی پیروی کرنے والے کرداروں کے روپ میں پیش کر کے اس عہد کے بعض نقائص کی پردہ کشائی کی ہے اور ہمارے سماج و معاشرے میں آئی تبدیلیوں کو ملک کے لیے نقصاندہ بتایا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں:

اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

خدا کے فضل سے بی بی میاں دنوں مہذب ہیں
حجاب اُس کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

کہتے ہیں راہِ ترقی میں ہمارے نوجواں
خضر کی حاجت نہیں ہم کو جہاں تک ریل ہے

خدمت بہت اہم ہے گروہِ پولیس کی
پروا کرو کچھ اُن کے الاؤنس وفیس کی

سول سرجن تو ساڑھے سات سے پہلے نہیں اُٹھتے
لیکن ان کے مرغے کی سحر خیزی نہیں جاتی

الٰہی رکھ تو سلامت ہمارے لیڈر کو
کہ بزمِ قوم میں اس سے چہل پہل تو ہے

چور کے ہے بھائی گرہ کٹ تو سنا کرتے تھے
اب سنتے ہیں اڈیٹر کے برادر لیڈر

اکبر نے اپنے کلام میں نہ صرف سماجی، سیاسی، معاشی وتہذیبی مسائل کے ذریعے اپنی قوم پر طنز کے نشتر چلائے ہیں بلکہ ان مذکورہ کرداروں میں نئی تہذیب سے مرعوبیت کی وجہ سے آئی تبدیلی کا بھی مذاق اڑایا ہے ان کے طنز کا تیر اگرچہ زہرنا کی لیے نہیں ہوتا بلکہ اس سے ضرب لگتی ہے لیکن آدمی اپنی اصلاح پر مجبور ہوتا ہے اور یہی ان کے طنز کا مقصد بھی ہے۔ موضوعاتی سطح پر اکبر نے طنزیہ ومزاحیہ کلام میں اپنی شاعری کے جہاں جوہر دکھائے ہیں وہیں زبان و اسلوب کی مرصع سازی کے ذریعے بھی اپنے کلام میں لطافت اور شگفتگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مثلاً: انگریزی، ہندی، فارسی، عربی لفظوں کی آمیزش سے مزاح پیدا کرنے کی ان کے یہاں کامیاب کوشش نظر آتی ہے۔ خصوصاً انگریزی زبان کے بے شمار الفاظ اکبر کے کلام میں بکھرے پڑے ہیں، جس کے برملا استعمال سے لطافت اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

یہی مرضی خدا کی تھی ہم ان کے چارج میں آئے
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ چارج میں آئے

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
مولوی و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر خوشی سے پھول جا

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ہمیں بھگوان کی کرپا نے تو بابو بنایا ہے
مگر یورپ کے شالا لوگ، نے اُلو بنایا ہے

کیوں کوئی آج ہرَ کا نام جپے
کیوں ریاضت کا جیٹھ سر پہ تپے

اکبر نے نہ صرف موضوعات کے اعتبار سے اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں اضافہ کیا بلکہ زبان و بیان کی خوبیوں کے اعتبار سے بھی انھوں نے مزاحیہ ادب کے میدان کو وسعت دی۔ اکبر کو چوں کہ زبان و بیان پر بھرپور قدرت حاصل تھی اس لیے انھوں نے عام بول چال کی زبان میں انگریزی زبان کا ایسا برجستہ استعمال کیا کہ اس سے مزاح نگاری کا لطف دوبالا ہوگیا۔ خصوصاً انگریزی زبان کے اس عہد میں رائج الفاظ کے ذریعے مغربی تہذیب کی ظاہر پرستی اور اندھی تقلید کرنے والوں پر انھوں نے اپنی تنقید کا نشانہ کسا اور انگریز پرست ہندستانیوں پر بھرپور چوٹیں کی۔ پنڈت کشن پرشاد کول ان کی انگریزی اور ہندی کے الفاظ کو اشعار میں کھپانے کی کوشش کی سراہنا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اکبر کو غیر مانوس لفظوں بالخصوص انگریزی اور ہندی کے لفظوں کو شعر میں کھپانے اور نباہنے کا کچھ ایسا سلیقہ تھا اور یہ بھی طنز و ظرافت کے رنگ اور زمین میں کہ لفظ لفظ نہیں رہ جاتے بلکہ نگوں کی طرح چمکنے لگتے تھے کہ جو مرصع کار کا کام ہو۔"

آگے لکھتے ہیں:

> "اکبر کے کلیات کی جلدوں میں پچاسوں اشعار ایسے ہیں جن سے انکی شاعری کے جوہر کھلتے ہیں۔ ان کی زندہ دلی اور ظرافت کی شوخیاں جھلکتی ہیں اور ان کے بے پناہ طنز کے نشتر چمکتے ہیں۔"

(پنڈت کشن پرشاد کول، اکبر الہ آبادی اور ان کی شاعری، علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، جامعہ ملیہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۵۰، ص ۴۰، ۴۱)

اکبر نے لفظوں کے الٹ پھیر سے بھی مزاح پیدا کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ان کے کلام میں تشبیہات محاوروں،ضرب الامثال،لفظوں کے الٹ پھیر،لفظوں کی تکرار اور صنعتوں کے عمدہ اور خوبصورت استعمال سے ظرافت کی پھلجھڑیاں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔چند اشعار بطور مثال دیکھیے:

زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو
اِس کو کالج اور اُسے کانوکیشن سمجھو

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑگیا

الگ ہے شخصیتِ حوادث،ہمیں سے یاوہ اُبھر رہے ہیں
یہ وقت ہم پر گزر رہا ہے کہ وقت پر ہم گزر رہے ہیں

دریا میں کیوں رہو کہ مگر سے ہو سابقہ
لیکن رہو تو چارہ ہی کیا بیر کے سوا

مہاتما جی سے مل کے دیکھو،طریق کیا،بھاؤ کیا ہے
پڑی ہے چکر میں عقل سب کی،بگاڑ تو ہے،بناؤ کیا ہے

خوب وہ دکھلا رہے ہیں سبز باغ
ہم کو بھی کچھ گل کھلانا چاہیے

رکھتے تھے جو بزرگ قدم پھونک پھونک کر
خوگر ہوئے ہیں لیپ کے اسکپ کے جمپ کے

اِس کو نہ خبر کچھ اُس کی ہے اُس کو ہے نہ کچھ پروا اِس کی
روتا ہے رلائے جاتا ہے،ہنستا ہے ہنسائے جاتا ہے

دنیا کا ذرا یہ رنگ تو دیکھ ایک ایک کو کھائے جاتا ہے
بن بن کے بگڑتا جاتا ہے اور بات بنائے جاتا ہے

ڈنر کا مجھ کو نہیں چسکا وگرنہ ہے کارڈ میں تو لکھا
شراب ہوگی،کباب ہوں گے،حضورِ عالی جناب ہوں گے

اکبر کے کلام کی ان مثالوں کے مطالعے کے بعد ان کے کلام کی خوبیاں ہم پر عیاں ہوتی ہیں اور ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی شعرا میں اکبر الہ آبادی ہی وہ منفرد شاعر ہے،جنھوں نے اپنے کلام کو ظرافت کی چاشنی سے زیادہ دلکش بنادیا ہے۔انھوں نے اپنے کلام میں چند ایک اشعار کو چھوڑ کر کہیں بھی اخلاق اور شائستگی کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا،بڑے لطیف اور شگفتہ انداز میں مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کرنے والوں کو ہدف تنقید بنایا ہے،اور قوم وملت کو مغرب کی ظاہر پرستی اور اندھی تقلید سے روکنے کے سلسلے میں رہنمائی کی ہے۔ان کی شاعری کا مقصد بھی یہی رہا کہ ہماری قوم کی بے جا مغرب پرستی کے اثر سے آزاد کرایا جائے اور ان کی خامیوں کی اصلاح کی جائے ۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جہاں مغرب کی نقالی کرنے والے ہندوستانیوں کی خامیوں کو بے نقاب کر کے ان کے معائب کی پردہ کشائی کی ہے وہیں زبان واسلوب کی نیرنگیوں کے ذریعے ایسا دل چسپ ولہجہ اختیار کیا کہ مشرقی قوم بذات خود اپنی اصلاح کرنے پر مجبور ہو جائے۔غرض اکبر اردو کے وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنے عہد کے معاشرتی وسماجی مسائل کی اصلاح کے ساتھ اردو طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے فن ومعیار کو بھی اونچا کیا اور اپنی مخصوص فکر ومنفرد نقطۂ نظر کے ساتھ اردو کے طنزیہ ومزاحیہ شعرا میں اپنی الگ پہچان بنائی اور یہی سبب ہے کہ جب کبھی اردو کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا ذکر کیا جائے گا وہ اکبر الہ آبادی کے نام کے بغیر ادھورا کہلائے گا۔

☆☆☆

مغربی علوم وفنون کا حامی اور تہذیبِ مغرب کا مخالف اکبر

ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد

ڈاکٹر عبداللہ صاحب (صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی) کی اب تک پانچ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، تین زیرِ طبع ہیں۔ لوک ادب اور تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سمینار میں شرکت اور ملک و بیرونِ ملک کے رسائل میں مضامین کی اشاعت کے سلسلے کا ذکر تفصیل طلب ہے۔ آپ بورڈ آف اسٹڈیز (اردو) کے چیئرمین بھی ہیں۔ ایڈمنسٹریشن صلاحیت خداداد ہے۔ کافی فعال شخصیت ہیں اور شعبۂ اردو ممبئی یونی ورسٹی کے ہر دل عزیز استاذ بھی۔ رابطہ: 9869198168 91+

Email: abdullahimteyaz4@gmail.com

سائنسی اور مشینی انقلابات نے مغربی قوموں کو دنیا میں سرخرو کیا اور مغربی تعلیم، تہذیب اور تمدن نے اپنی نوآبادیات (کالونیاں) کے باشندوں کو کس قدر متاثر کیا یہ جگ ظاہر ہے۔ غدر کے بعد ہندوستانی کلچر میں تیزی سے تبدیلی آ رہی تھی۔ مغرب کی کورانہ تقلید کو لوگوں نے اپنی فلاح کی راہ سمجھ لی تھی اور مغربی نظریات مذہبی تقدس پر غالب آتے جا رہے تھے۔ یہی دور اکبر کی شاعری کا محرک بنا اس پر سرسید کی تحریک نے اور بھی غضب ڈھایا۔ مذہب اور ہندوستانی کلچر کے معاملے میں اکبر سخت گیر تھے، اس میں کسی طرح کی تبدیلی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ذریعہ مغرب کی اندھی تقلید کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اکبر ذہین اور دور اندیش تھے اور نئی روشنی کے حامی بھی لیکن روایت پرستی سے وہ دست بردار بھی نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ہمارے علمائے ادب نے اکبر کے نظریات پر جو متفقہ رائے دی ہے وہ اس طرح سمجھی جا سکتی ہے: سرسید کی تحریک مغربی جلوے کے ساتھ تھی جس سے اکبر متنفر تھے۔ مغرب کی جدید تعلیم ادب و اخلاق کی غارت گری کا سبب بنتی جا رہی تھی جس سے اکبر کو بیزاری تھی کیوں کہ اس سے مفاد پرستی اور دین سے دوری کا احساس ہو رہا تھا۔ کالج کو اکبر نے اس لیے تنقید کا نشانہ بنایا کہ اخلاقی فساد کا تخم یہیں زیادہ زرخیز ہوتا ہے۔ اکبر مشرقی عقل و شعور کے لیے مغرب کو بدترین دشمن سمجھتے تھے اور اس کے دلکش فریب سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ مغربی تعلیم کو عورتوں کے لیے وہ اخلاقی فساد کی جڑ سمجھتے تھے، ان کے خیال میں اس طرح بے حیائی عام ہوگی، عورت ہر کسی کے اعصاب پر سوار ہوگی اور شہوت کا بازار گرم ہوگا۔ اکبر کسی بھی قسم کی ایسی ترقی کے شدید مخالف تھے جو رب کائنات کی عظمت کو فراموش کر دے جس سے انسان میں رعونت آ جائے۔

مذکورہ بالا چند بنیادی نقطے ہیں جن کی اساس پر مشرق و مغرب کے تعلق سے اکبر کے نظریات کی تفہیم کی جا سکتی ہے۔

مغربی علوم وفنون کے نقطۂ نظر سے بات کی جائے تو اکبر اس کے اسی قدر مخالف تھے کہ اس سے توحید کو ضرب نہ لگے، وہ علم وفن جس سے

وحدانیت پر حرف آئے اور دین و ایمان کو کمزور کرے، اسے اکبر کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ صرف مذہب ہی نہیں وہ مشرقی تہذیب کے معاملے میں بھی اتنے ہی سخت قدم تھے۔ جس کا اندازہ اکبر کی اس رباعی سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

اکبر نے جگہ جگہ نئی تعلیم اور کالج کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جدید تعلیم نسل نو کے مزاج کو خراب کر رہی ہے اور ادب و احترام پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ کالج میں جدید تعلیم تو دی جاتی ہے لیکن ان کے اخلاق پر توجہ نہیں دی جاتی، جس سے نئی نسل آزاد روی اختیار کر کے اپنے اسلاف کی روایت سے دور ہوتی جا رہی ہے:

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جس کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں
نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

اکبر کی مغرب مخالف طبیعت پر ڈاکٹر صغرائی مہدی کچھ اس طرح سے روشنی ڈالتی ہیں:

''اکبر الہ آبادی کی تعلیم بنیادی طور پر مذہبی تھی۔ ان کی طبیعت شروع ہی سے تصوف کی طرف مائل تھی اور یہ ذوق انھیں اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملا تھا۔ انھیں اپنے ملک، اپنی تہذیب، اخلاقی قدروں اور روایات سے شدید جذباتی لگاؤ تھا۔ نوکری کے سلسلے میں انھیں انگریز حکام سے براہ راست سابقہ پڑا تھا۔ وہ خود بھی ان کے حقارت آمیز برتاؤ کا نشانہ بنے تھے اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ بھی انھوں نے ایسا سلوک ہوتے دیکھا تھا۔ انھیں انگریزوں اور ان کی تہذیب و معاشرت سے جس میں مادیت کا عنصر غالب تھا، دلی نفرت تھی۔''

(اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ص ۳۰۔ ڈاکٹر صغرائی مہدی، اشاعت اول، ۱۹۸۱ء)

ایسی کئی مثالیں مل جائیں گی جس سے اکبر کے جدید تعلیمی نظریے کا پتہ چلتا ہے۔ سرسید تحریک اور علی گڑھ کالج کے خلاف بھی وہ اسی لیے تھے کہ وہاں صرف تعلیم ہی مغربی نہیں بلکہ وہاں کے کلچر کو بھی اپنانے میں کوئی عار نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ مغربی تہذیب کو اپنانے میں علی گڑھ کالج پیش پیش تھا اسی لیے اکبر نے اسے لندن کی مسجد کہا ہے:

بزرگانِ ملت نے کی ہے توجہ
کی پر رہیں گے نہ عالم نہ عابد
ترقی دیں ہوگی اب روز افزوں
علی گڑھ کا کالج ہے لندن کی مسجد

لیکن جب وہ سرسید سے ملتے ہیں اور ان کے افکار جانتے ہیں اور ان کے قومی جذبے کو دیکھتے ہیں تو اس کی سراہنا بھی کرتے ہیں اور سرسید کے تعلق سے ان کے ذہن و دل میں جو منفی خیالات تھے اس میں تبدیلی آتی ہے، جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے نا تمام
بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانہ کے حسب حال
پھر کیا امید دولت و آرام و احترام

سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
دکھلا دیا زمانہ کو زور دل و دماغ
بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بصد شان و احتشام

اکبر نے جدید اور عصری تعلیم پر بھی زور دیا ہے۔ وہ روایت پرست ضرور تھے لیکن وقت کی رفتار سے غافل نہیں تھے اور سرسید سے ملاقات کے بعد ان کی وسیع النظری کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے:

جو بات مناسب ہے وہ حاصل نہیں کرتے
جو اپنی گرہ میں ہے اسے کھو بھی رہے ہیں
بے علم بھی ہم لوگ ہیں غفلت بھی ہے طاری
افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

عورتوں میں جدید تعلیم کے بڑھتے رجحان سے اکبر فکر مند تھے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے لیکن کالج میں لڑکے اور لڑکیوں کا ایک جماعت میں پڑھنا صرف اکبر ہی کو نہیں ہر ذی شعور کو ناگوار گزر رہا تھا۔ اس طرح بے حیائی عام ہو رہی تھی، عورتوں کی اس آزادروی کو اکبر قوم وملت کا بڑا خسارہ تسلیم کرتے تھے۔ ان کے خیال میں عورتوں کے لیے جدید مغربی تعلیم کے بجائے دین کی تعلیم ضروری ہے۔ گھر، خاندان، معاشرہ اور قوم کو بنانے اور بگاڑنے میں عورت کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے۔ نسلوں کی پرورش اگر مذہب واخلاق کے دائرے میں رکھ کر نہیں کی جائے گی تو وہ صحت مند تہذیبی قدروں کی امین نہیں بن پائیں گی۔ اپنے اس نظریے کا اظہار اکبر نے کئی بار کیا ہے:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں
ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اسے شوہرو اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اکبر مغربی تہذیب سے متنفر اور بیزار تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ عورتوں کی بے پردگی اور مردوں کے شانہ بہ شانہ زندگی کے ہر شعبے میں عمل دخل کا ہونا، ان کا نیم عریاں لباس، وضع قطع اور غیر مردوں کے ساتھ تقریبات میں رقص وسرور وغیرہ۔ یہ سب وجوہات ایسی ہیں جسے مشرقی تہذیب کا دلدادہ کبھی قبول نہیں کرسکتا۔

اس بت نے کہا کہ تو ہے بے علم و خرد
کھول آنکھ زمانے کے موافق ہوجا
آخر میں کھلا کہ اس کا مطلب یہ تھا
اللہ کو چھوڑ مجھ پہ عاشق ہوجا

دکھائی فلسفۂ مغربی نے وہ مردی
کہ پردہ کھل گیا اس قوم میں زنانوں کا

پری کی زلف میں الجھا نہ ریش واعظ میں
دل غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا
وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لیے
خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

ہوائے کوچۂ مشرق کی موجیں یاد ہیں ہم کو
وہی تھی منزل راحت وہی رفتار اچھی تھی
نئی محفل کی نکھائی تو گویا طوق گردن ہے
وہی بت خانہ بہتر تھا وہی زنار اچھی تھی

اکبر مغرب کے علوم وفنون کے علاوہ وہاں کی ہر چیز کو رد کرتے تھے۔ وہ چاہے وہاں کے پکوان ہوں یا لباس، تہوار ہوں یا تقریب، غرض کہ مغربی تہذیب کے سبھی عنصر ان کے لیے قابلِ قبول نہیں تھے:

چھیڑنا اچھا ہے ساز سعی کا اس بزم میں
آدمی کو زندگی میں اک نہ اک دھن چاہیے
ہو دسمبر میں مبارک یہ اچھل کود آپ کو
خون مجھ میں بھی ہے لیکن مجھ کو پھاگن چاہیے

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن
اس شوخ کے گھنگھرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

اکبر مغربی تہذیب وتمدن ہی نہیں وہاں کے ادب اور آدابِ عاشقی کے بھی خلاف تھے:

عاشقی ان کی نہیں ہے عقل سے بالکل جدا
اہل دل وہ بھی ہیں لیکن دل بدن کے ساتھ ہے
وہ نہیں ہیں میرے چاک جیب وداماں میں شریک
ہے جنوں ان کو بھی لیکن پیرہن کے ساتھ ہے
مجھ کو الجھانے کو کافی ہوگئی سنبل کی شان
جوش سودا ان کا زلف پر شکن کے ساتھ ہے

مندرجہ بالا اشعار میں اکبر نے جو مغربی فلسفۂ عشق اور آدابِ عشق کا ذکر کیا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں مغربی تہذیب کے پھیلائے ہوئے پر کا عکس صرف ہندوستان ہی نہیں دنیا بھر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اکبر کی قوم پرستی کے تعلق سے فضیل جعفری فرماتے ہیں:

"اس پر آشوب دور میں جب قوم پرستی کی اصطلاح بھی رائج نہیں ہوئی تھی اکبر نے کس کٹر قوم پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام ہندوستانیوں کو مغرب کی اندھی تقلید سے دور رکھنے کی جو انتھک کوشش کی اور اتحاد باہمی کی تلقین کی وہ ہمارا بیش قیمت شعری ہی نہیں، تاریخی، تہذیبی اور قومی سرمایہ بھی ہے۔"

(فضیل جعفری، مضمون: کلام اکبر کا قومی کردار، مشمولہ سہ ماہی فکر وفن، جنوری۔مارچ ۲۰۰۹ء)

فضیل جعفری کے قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو اکبر واقعی قوم پرستی اور مشرقی تہذیب وتمدن کے پرستار تھے۔ وہ کسی بھی قیمت پر مغربی تہذیب کو مشرقی تہذیب پر فوقیت نہیں دے سکتے تھے۔

☆☆☆

اکبرالہ آبادی: ایک نابغۂ عصر شاعر

ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی

ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی، شعبۂ اردو، سینٹرل یونی ورسٹی آف کشمیر سے وابستہ ہیں۔ ان کی دلچسپی کا میدان کلاسیکی اردو شاعری، لسانیات اور مشینی ترجمہ ہے۔ اردو زبان، اردو میں مشینی ترجمہ اور شعری موضوعات پر ہمہ قسم کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے گریجویشن تک کی تعلیم اپنے وطن عزیز اعظم گڑھ اور ماسٹرس تا پی ایچ ڈی کی تعلیم جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی سے حاصل کی ہے۔ علاوہ ازیں وہاٹس اپ اور ٹیلی گرام گروپ ''القلم'' کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر کتابوں کی پی ڈی ایف فائل سے اہل زبان وادب، اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں کی مدد اور رہنمائی کا فریضہ بھی بڑی مستعدی سے انجام دے رہے ہیں۔

Cont. 8803765953 / Email: p123azmi@gmail.com

اکبرالہ آبادی (۱۹۲۱ء۔۱۸۴۶ء) کا اصل نام سید اکبر حسین تھا، ان کی پیدائش ۱۶ رنومبر ۱۸۴۶ کو الہ آباد ضلعے کے ایک گاؤں 'بارا'' میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی تھی۔ ''بارا'' آج الہ آباد ضلعے کی ایک تحصیل ہے۔ ۱۸۶۹ء میں ''مختاری'' کا امتحان پاس کیا اور نائب تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہیں سے ترقی کرتے ہوئے ہائی کورٹ تک پہنچے اور ۱۸۹۸ء میں انگریز سرکار نے ''خان بہادر'' کے لقب سے نوازا۔ شاعری میں انھوں نے شروع شروع میں آتش سے مشورۂ سخن کیا مگر آگے چل کر اپنا ایک الگ رنگ قائم کیا۔ وہ مشرقیت کے حد درجہ شیدائی اور مغربیت کی اندھی پیروی کے سخت مخالف تھے۔ اسی لیے کہا تھا کہ:

پانی پینا پڑا ہے پایپ کا\
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹایپ کا\
مل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے\
آب و دانہ کی حکمرانی ہے

اردو شاعری کی تاریخ میں اکبرالہ آبادی ایک ایسا منفرد نام ہے، جس نے 'مدخولۂ گورنمنٹ' ہونے کے باوجود اپنے خیالات، جذبات، احساسات، تصورات، مشاہدات اور تجربات کا اظہار خوب سے خوب تر طریقے سے کرنے کی کوشش کی۔ چوں کہ وہ ایک سرکاری عہدے پر فائز تھے، اس لیے انہیں اپنے تفکر اور تصور کے اظہار کے لیے اشارے، کنائے اور استعارے کا سہارا لینا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کچھ ایسے کردار بھی تخلیق کیے، جن سے ایک خاص طبقے کی نمائندگی ہو سکے اور ترسیل کا عمل ایسا کہ 'ادھر منہ سے نکلے ادھر دل میں اترے' والی بات بھی پیدا ہو جائے۔ جیسے: جمن، بدھو، کالج، وفاقی اور مولوی وغیرہ۔ ان نئی تراکیب اور کرداروں کے استعمال سے اردو شاعری کے قاری چونکے اور متوجہ بھی ہوئے۔ اس سے بات بھی خوب سے خوب تر ہو گئی اور حرف بھی کبھی حرف بھی نہیں آیا۔ روایتی شاعری سے الگ انھوں نے ایک سے بڑھ کر ایک تراکیب اور لفظیات استعمال کیں اور اسی سے ان کی انفرادیت بھی بڑی خوبی سے قائم ہوتی چلی گئی۔ مثال کے لیے ملاحظہ ہو:

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے
کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

شانِ نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے
مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاقی

مسجد میں شیخ صاحب! گرجا میں لاٹ صاحب
بدھو فلاسفی کے کمرے میں سڑ رہے ہیں

ہر چند کہ اکبر نے طنز و ظرافت کے ساتھ ساتھ حسن و عشق، عرفان و آگہی، فلسفہ و سیاسیات، اخلاق و عادات وغیرہ کے موضوعات بھی اپنے کلام میں پیش کیے ہیں لیکن ان کے نام کے ساتھ طنز و ظرافت کو اس طرح سے جوڑ دیا گیا کہ لگتا ہے کہ انھوں نے اس کے علاوہ کچھ کہا ہی نہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلیات میں ہر رنگ کا کلام موجود ہے۔

نابغہ کا مطلب 'غیر معمولی ذہین' یا 'اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا حامل' ہوتا ہے، جسے انگریزی میں genius کہتے ہیں۔ اس کا عام طور سے یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ جس زمانے میں کوئی شخصیت رہی ہے، اس زمانے کا علمی معیار، افکار اور تصورات کیا تھے؟ اگر کوئی شخص اپنے عہد کے تصورات و تفکرات کے اعتبار سے ذرا سا بلند یا زیادہ علم اور دور اندیشی رکھتا ہے تو ہم اسے نابغۂ عصر کہتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال سر سید احمد خاں اور علامہ اقبالؔ ہیں۔ راقم السطور نے اکبرالٰہ آبادی کو نابغۂ عصر اسی لیے کہا ہے کہ ان کے عہد میں جو تصورات و تخیلات پروان چڑھ رہے تھے، وہ ان کو محسوس کر رہے تھے کہ آنے والا وقت کیا اور کیسا ہوگا؟ اسی لیے لوگوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی دور اندیشی کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے آج سے سو؛ سوا سو سال پہلے جو کچھ قیاس کیا تھا، وہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے حقیقت بن کر کھڑا ہے۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

حکم برٹش کا، ملک ہندو کا
اب خدا ہی ہے بھائی صلو کا

اب اگر درج بالا اشعار پر غور کیا جائے تو آج کی سیاست کو بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے اور اس مصرعے پر تو سر دھننے کو جی چاہتا ہے کہ "رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ"۔ ہماری سیاست کا حال آج ایسا ہی کچھ ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کو آنے والی سیاست کی آگہی ۱۰۰ر سال پہلے ہو گئی تھی۔ درج بالا اشعار پڑھنے اور آج کے حالات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اکبر کی نگاہ انگریز سرکار کے ذریعے بھارت میں لائی جانے والی ہر چھوٹی بڑی تبدیلی پر ہوتی تھی۔ وہ ہر تبدیلی کو مشکوک نظر سے دیکھتے اور اپنے محسوسات کو طنز و ظرافت کی لطیف چادر میں لپیٹ کر پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک کو مصنوعی رنگ و روغن خیال کرتے تھے۔ اسی لیے ٹائپ کا حرف پڑھنے اور پائپ کا پانی پینے تک کی نقطہ چینی کی۔ سرکاری ملازم ہونے کے باعث اپنی بات کو رمزیہ اور طنز و ظرافت کی لطیف چادر میں لپیٹ کر پیش کرتے تھے۔ شاید انھیں اپنی اس حیثیت کا بہ خوبی اندازہ تھا، اسی لیے کہا ہے کہ:

مدخولۂ گورمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

اردو شاعری کی تاریخ میں طنز و مزاح کے حوالے سے اکبر کا مقام بلند تر ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے یہ تخمینہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں حالات حاضرہ پر بے لاگ تبصرے کیے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ بے لوث نقاد کی حیثیت

سے لینے کی ہر ممکن سعی کرتے اور جو کچھ محسوس کرتے، اسے لفظوں کے قالب میں ڈھال کر پیش کر دیتے تھے۔ انگریز کس طرح مکر کی چالوں اور شعبدہ بازیوں کے ذریعے بھارتیوں کو اپنی چالوں کا شکار بنا رہے تھے۔ انھیں انگریزوں کی سیاسی برتری اور بھارتیوں کی محکومی کا شدید احساس ہو رہا تھا کہ:

انقلابِ دہر دیکھو بن گیا آقا غلام
قصر کا مالک جو تھا اب اس کا درباں ہوگیا

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

تمھاری پالسی کا حال کچھ کھلتا نہیں صاحب
ہماری پالسی تو صاف ہے ایماں فروشی کی

یہ طنز بھارتیوں کی حماقت پر ہے اور ایک طرح سے انھیں انتباہ بھی ہے کہ اپنی چاپلوسی سے باز آئیں ورنہ انگریز حکمراں انھیں کہیں کا نہ چھوڑیں گے۔ اپنے معمولی معمولی کام اور وقتی فائدے کے لیے روایتی اخلاقیات کو ترک کر، ایمان فروشی مشرقی اقدار کے خلاف ہے، اسی لیے اکبر اپنے مخصوص انداز میں آگاہ کر رہے تھے۔ انگریز جس طرح سے سبز باغ دکھا کر ہندستانیوں کا دل جیتنے اور انھیں فریب دینے کا کام کر رہے تھے، اس کو دیکھتے ہوئے اکبر کا کہنا تھا کہ:

خوب وہ دکھلا رہے ہیں سبز باغ
ہم کو بھی کچھ گل کھلانا چاہیے

رعایا کو مناسب ہے کہ باہم دوستی رکھیں
حماقت حاکموں سے ہے توقع گرم جوشی کی

ابھی تک ہم نے جتنے اشعار نقل کیے ہیں، اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اکبر کے نزدیک انگریزوں کی مکر و فریب کی چال اتنی نقصان دہ نہیں تھی جتنی کہ ہندوستانیوں کی خوشامد پسندی تھی۔ ہمارے اپنے لوگ سرکاری عہدے، مراعات اور معمولی فائدے کے لیے طرح طرح کی سیاسی چال بازیاں انگریزوں کو سکھاتے تھے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کہ اسی وجہ سے ہندستان کا بہت خسارہ ہوا۔ یہی اسباب تھے کہ انھوں نے پنڈت و ملا اور شیخ و برہمن کو اپنے تیر کا بار بار نشانہ بنایا اور خوب سے خوب تر کی طرف گامزن رہے۔ ہندستانی سماج میں پنڈت اور ملا کی حیثیت ہمیشہ سے ایک مذہبی رہنما کی رہی ہے، اسی وجہ سے سماج میں ان کا بہت احترام کیا جاتا ہے مگر یہ لوگ:

میخانۂ رفارم کی چکنی زمین پر
واعظ کا کا خاندان بھی آخر پھسل گیا

کرگئی کام نگاہِ مِس پر فن کیسا
تج چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا؟

کہاں کی پوجا نماز کیسی کہاں کی گنگا کہاں کا زمزم؟
ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک ہمیں بھی دو ایک جام صاحب

یہ اشعار اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اکبر یہ خیال کر رہے تھے کہ اگر ہماری قوم انگریزوں کے دام میں آگئی تو اس کو غلامی سے نجات ملنا مشکل ہو جائے گا۔ پنڈت و ملا بھی اگر اپنی روایتی تعلیمات یعنی سماج کو صحیح راستے پر چلنے کی تلقین کرنا چھوڑ کر چند سکوں یا عہدوں کے لالچ میں انگریزوں کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے تو پھر اس قوم کا خدا ہی حافظ ہوگا۔ اسی لیے وہ دونوں کو طرح طرح سے خبردار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اکبر کے کلام سے مذکورہ بالا قسم کے ان گنت شعر نقل کیے جا سکتے ہیں مگر ایک مضمون میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان، دونوں اس ملک کی بڑی قومیں ہیں اگر دونوں

ہی انگریزوں کے دامِ فریب میں آ گئیں تو پھر اس ملک کا خدا ہی حافظ ہوگا لہٰذا وہ دونوں ہی کو انگریزوں کی شعبدہ بازی سے باخبر اور ہوشیار رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ انگریزوں کے ذریعے کی جانے والی ترقی کی کوششوں، نئی نئی اصلاحات اور جدید کاری کو بھی اکبر مشکوک نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے اس نظریے کی نشاندہی کرتے ہوئے صدیق الرحمٰن قدوائی تحریر کرتے ہیں:

"اکبر اپنے دور کی زندگی اور اس کے مسائل کو ایک کارٹونسٹ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ ہمیشہ مغربی اثرات کے تحت چلنے والی جدید اقدار کے مضحک پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ اپنے تخیل کی بدولت اور زبان کے ذریعے وہ ان پہلوؤں کو اور زیادہ مضحک بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ایک کارٹونسٹ اپنے اسکیچ میں بعض خطوط کو گھٹا بڑھا کر ان پہلوؤں کو نمایاں کر دیتا ہے جن پر طنز کرنا مقصود ہو۔"[1]

اکبر کا شعور یہ کہہ رہا تھا کہ ان اصلاحات کے پیچھے انگریز اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اسی لیے ان کی نگاہ انگریزوں کے نئے کاموں کے منفی پہلوؤں پر زیادہ اور تیکھی ہوتی تھی، جسے قدوائی صاحب نے کارٹونسٹ کے نظریے سے دیکھنا تسلیم کیا ہے۔

اکبر الہ آبادی کے کلام یعنی غزلوں اور نظموں میں اگر دیکھا جائے تو اس طرح کے شعر اور بند بارہا ملیں گے، جن میں انہوں نے ہندستانیوں کو آگاہ کرنے اور انگریزوں کی چالوں سے بچنے کے لیے تنبیہ کی ہے۔ انگریزوں نے اپنی سوچی سمجھی سیاسی پالیسی "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" کے نظریے کے تحت ہندستانیوں کو منتشر کرنے کی ہر ممکن سعی کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ملک کے لوگوں میں آزادی کی تڑپ، غلامی سے نفرت اور احتجاج کا جذبہ سرد نہیں ہوا تھا۔ اکبر چوں کہ نابغۂ عصر تھے، اس لیے بھارتیوں کو آئندہ زمانے میں ہونے والی مشکلوں کا کسی قدر تخمینہ لگا رہے تھے اور جو کچھ محسوس کرتے تھے، اس سے قوم کو باخبر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک نظم "برٹش راج" سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے

یہ نظم ایک طنزیہ نظم ہے، جس کا لطف مکمل مطالعے ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی بہت سی ایسی نظمیں ہیں، جن میں وہ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی قلعی کھولتے نظر آتے ہیں۔ جب ملک میں "ترکِ موالات" کی تحریک چلی تو انھوں نے کہا:

انقلاب آیا، نئی دنیا، نیا ہنگامہ ہے
شاہ نامہ ہو چکا، اب دورِ گاندھی نامہ ہے

انگریزوں کے ذریعے لائی جانے والی ہر تبدیلی میں اکبر کو کچھ نہ کچھ گڑبڑ نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھارت میں ریل خدمات کا آغاز ہوا تو اس میں بھی انھیں فریب ہی نظر آیا۔ کیوں کہ انھیں یہ بات بہ خوبی معلوم تھی کہ:

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

ظاہر ہے جو شاعر اپنی فکر، تجربے، مشاہدے اور دوراندیشی سے اس نتیجے پر پہنچ چکا ہو، جیسا کہ درج بالا شعر سے واضح ہے تو پھر اس کو ہر جگہ، ہر کام اور ہر پہل میں شبہ ہونا ہی ہونا ہے۔ دوسری طرف انھیں یہ خدشہ تھا کہ لالچ میں آ کر ہمارے لوگ انگریزوں کے مزید طرف دار نہ

بن جائیں ورنہ آزادی کا حصول مزید دشوار ہو جائے گا۔ اس لیے اس سے بھی خبردار کرنے کی کوشش کی۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری، فکر اور تصورات کو ہم لوگوں نے طنز و مزاح سے آگے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ ان کے کلام میں ہر رنگ کے مضامین ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں روایتی مضامین یعنی حسن و عشق کی کیفیات، گل و بلبل کی واردات، فلسفہ و تصوف اور سماجی مسائل وغیرہ کے مضامین بھی بڑی عمدگی کے ساتھ باندھے گئے ہیں مگر افسوس کہ ہم نے اکبر کو طنز و مزاح کے دائرے میں محدود کرنے کی کوشش کی۔ اکبر نہایت ذہین تھے اور مدخولہ گورنمنٹ بھی، اس لیے وہ سرکار کی ریشہ دوانیوں، سیاسی جعل سازیوں اور شعبدہ بازیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قدم پر دور بینی اور دور اندیشی کا اپنے کلام کے ذریعے پیغام دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سرسید نے جب اپنا تعلیمی پروگرام آگے بڑھایا تو ان کے بہت سے مخالف میدان میں کود پڑے اور انھیں نہ جانے کیا کیا کہا لیکن آخر کار انھیں تعلیم کا پیغمبر بھی کہا گیا۔ اسی طرح اگر ہم اکبر کی شاعری کو پڑھیں اور غور کریں تو ہمیں احساس ہوگا کہ وہ جو کچھ اس زمانے میں کہہ رہے تھے، وہ باتیں آج بھی بہت اہم ہیں۔ مثال کے لیے درج ذیل شعر دیکھیں:

عزت ملی ہے شرکتِ کونسل کی شیخ کو
غازہ مَلا گیا ہے رخِ فاقہ مست پر

کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۰۰ رسال قبل کہے گئے اس طرح کے شعر آج اپنی معنویت نہیں رکھتے ہیں۔ خوشامد پرستی اور چاپلوسی، "اپنا بھلا؛ بھلا جگ ماہیں" کا قاعدہ تب سے آج تک ہمارے معاشرے میں ویسے ہی برقرار ہے، اس لیے اکبر کی دور اندیشی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ شاعر نے اپنے مافی الضمیر کی ادائگی خوب سے خوب تر طریقے سے کی، قوم کو اپنا پیغام اور اپنی فکر سے آشنا کیا۔ آنے والے وقت میں لوگ اپنے معمولی فائدے کے لیے کچھ بھی کرنے سے گریز نہیں کریں گے، شاید انھیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا مگر افسوس ہم نے ان کے پیغامات کو ان سنا کر دیا۔ جیسے جیسے ان کا احساس شدید ہوتا گیا، ان کے طنز میں بھی شدت آتی گئی اور ان کی شاعری اپنے کمالات کی انتہا کی طرف ترقی کرتی گئی۔

محفل میں ذرا ہاتھ ملا لیجیے مجھ سے
صاحب میرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

آج بھی ہماری قوم اسی دائرے میں گھوم رہی ہے، جیسا کہ اکبر نے درج بالا شعر میں فرمایا ہے۔ ضرورت ہے کہ اب ہم اکبر کی شاعری کی معنویت کو سمجھیں اور مستقبل کے لیے ایک لائحہ عمل ترتیب دیں۔

کتابیات:

۱۔ کلیاتِ اکبرالہ آبادی (مکمل)، "اردو بکس" واٹس ایپ گروپ آن لائن ایڈیشن

۲۔ اکبرالہ آبادی: ایک سماجی و سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر افصح ظفر، عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی۔ ۹۵

۳۔ فکر و تحقیق، اکبرالہ آبادی نمبر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی۔ جنوری تا مارچ ۲۰۰۹

۴۔ انتخابِ اکبرالہ آبادی، صدیق الرحمن قدوائی (مرتب)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ ۱۹۷۳ء

حوالہ:

۱۔ انتخابِ اکبرالہ آبادی، صدیق الرحمن قدوائی (مرتب)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ ۱۹۷۳ء، ص نمبر۔ ۲۷

☆☆☆

اکبرالہ آبادی کی اصلاحی وطنزیہ شاعری

ڈاکٹر قاضی نوید

ڈاکٹر قاضی نوید (صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد) کا شمار اورنگ آباد کی اہم ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑا یونی ورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز (اردو) کے ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر یونی ورسٹی کے بورڈ کے بھی ممبر ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ کئی قومی سیمینار کا انعقاد کر چکے ہیں۔ اورنگ آباد کی قدیم ادبی انجمن "مطلع ادب" کے صدر بھی ہیں۔

رابطہ: 9860839355 91+

خان بہادر سید حسین اکبرالہ آبادی انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی حصے کے مشہور شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز غزل سے کیا۔ اگر چہ کہ اکبر غزل کے بڑے شاعر نہیں تھے لیکن ان کی غزلوں سے اردو غزل کے ایک نئے انداز کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ قافیوں کے بادشاہ سمجھے جاتے ہیں اور فنی اعتبار سے ان کا درجہ بہت اونچا ہے۔ ان کے پاس تغزل بھی پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آسمان سے تارے توڑ لائے ہیں:

میری بے تابی دل پر ادا سے مسکراتے ہیں
قیامت کرتے ہیں بجلی پہ وہ بجلی گراتے ہیں
وہ شرارت سے مرے گھر سرِ شام آتے ہیں
یہ دکھانا ہے کہ غیروں کے پیام آتے ہیں
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اکبرالہ آبادی زمانے کے نباض تھے۔ انھوں نے اپنے عصری تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ دراصل جس دور میں انھوں نے شاعری کی یہ ایسا دور تھا جب ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی ناکام ہو چکی تھی جس کے سبب سیاسی حالات یکسر تبدیل ہو گئے تھے۔ تخت و تاج تاراج ہوئے اور ہندوستان پر انگریزی حکومت کی پکڑ مضبوط ہو گئی اور انگریز فاتح قوم بن کر ابھرے۔ ظاہر ہے کہ فاتح قوم کی تہذیب و تمدن مفتوح قوم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہندوستانی عوام بھی ذہنی طور پر انگریزوں کی غلامی میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ وہ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک و دمک سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی اصل کو بھولنے لگے۔ اپنی تہذیبی اقدار کی روشن قدروں کو فراموش کرنے لگے۔ حتیٰ کہ اپنی مذہبی تعلیمات سے بھی غافل ہونے لگے۔ اسی عہد میں سرسید احمد خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اصلاحِ معاشرہ کو تحریکی شکل دینے میں منہمک تھے۔ سرسید احمد خان مغربی علوم سے استفادے پر زور دے رہے تھے۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی اردو شاعری کی اصلاح کر رہے تھے۔ محمد حسین آزاد کرنل ہالرائیڈ کی ایما پر جدید نظم کو فروغ دینے میں کوشاں تھے۔ عوام انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہونے لگے تھے۔ اور انگریزوں کے طور طریقوں کو اپنانے میں اپنی شان سمجھنے لگے۔ ان حالات میں قوم کا درد رکھنے والے مفکروں کے

لیے یہ ایک سانحے سے کم نہیں تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے لیے اپنے مشرقی تہذیبی سرمائے سے پوری طرح دست بردار ہونا کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے مغربی تہذیب کی ظاہرداری اور کھوکھلے پن کو عوام الناس کے سامنے بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔ ان مفکروں میں علامہ اقبالؔ اور اکبرالہ آباری پیش پیش تھے۔

ان حالات کے پیش نظر اکبرالہ آبادی اصلاحی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ خواجہ الطاف حسین حالیؔ سے متاثر ہوئے لیکن سرسید احمد خان کی تحریک سے کلی موافقت نہیں رکھتے تھے اس لئے کہ وہ انگریزی حکومت سے سمجھوتا اور مغربی علوم کی پیروی کرتے تھے جبکہ اکبرالہ آبادی مشرقی علوم و مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ وہ ایک مذہبی گھرانے کے فرد تھے اور مشرقی تہذیب کے پروردہ ہونے کے سبب مشرقی تہذیب و اقدار ان کی رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے۔ جب انھوں نے مغربی تہذیب کی یلغار کو دیکھا تو انھوں نے اس کے اثرات کو روکنے کے لیے شاعری کا سہارا لیا اور اپنے طنزیہ اشعار کے ذریعے مغربی تہذیب کے زیر اثر پیدا ہونے والی مذہبی بیزاری، مادہ پرستی اور ہندوستانیوں کی مغرب کے لیے اندھی تقلید پر کاری ضرب لگائی:

حرم والوں سے کیا نسبت بھلا ہم اہل ہوٹل کو
وہاں قرآن اترا ہے یہاں انگریز اترے ہیں

سرسید احمد خان ہندوستانی مسلمانوں کو جہاں زمانے کے قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، وہیں اکبرالہ آبادی کا یہ خیال تھا کہ ہمیں مشرقی علوم اور مشرقی تہذیب و تمدن کی قوی قدروں اور کارناموں پر یقین رکھنا چاہیے اور اس کی بقا کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ اکبرالہ آبادی کو مذہبی اور اخلاقی اوصاف مشرق میں نظر آتے ہیں جبکہ مغرب کی تقلید میں لامذہبیت اور مادہ پرستی میں اضافہ ہوتا ہے۔ انھیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ مغربی اثرات سے ملک کا روحانی مزاج تباہ ہو جائے گا تو انھیں اپنی تہذیب و تمدن اور مشرقی علوم و فنون کے تحفظ کی بڑی فکر لاحق ہوئی:

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر
نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہی کہ گویا آب زم زم مے میں داخل ہے

اکبرالہ آبادی نے اپنی شاعری کو قوم کی اصلاح کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اصل میں اقبال اور اکبرالہ آبادی کا مقصد ایک ہی تھا کہ وہ مغربی تہذیب کی یلغار کو روک سکیں اور نوجوانوں کو یورپ کی اندھی تقلید سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ دونوں نے اپنے اپنے انداز میں اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اقبالؔ نے شاعری میں سنجیدہ طرز کو اپنایا جب کہ اکبر نے طنز و مزاح کو شعری وسیلہ بنایا۔ اقبالؔ نے کہا تھا:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

وہیں اکبرالہ آبادی کہتے ہیں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑھ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

دراصل اکبر مغربی علوم سے ہونے والے مضر اثرات کی نشاندہی کرکے اپنی تہذیب کی بقا چاہتے تھے۔ کہتے ہیں:

میں ریش دکھاتا ہوں کہ اسلام کو دیکھو
وہ زلف دکھاتی ہے کہ اِس لام کو دیکھو

اکبر تعلیم نسواں کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ لڑکیاں اپنے مذہبی حدود میں رہ کر جو ترقی کرنا چاہے کر سکتی ہیں:

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ کو چھولو
ہر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

ایسا نہیں کہ اکبرالہ آبادی نے صرف لڑکیوں پر طنز کر کے ان کی اصلاح کی کوشش کی ہے بلکہ وہ قوم کے نوجوانوں کی بھی اصلاح چاہتے تھے۔ اپنے بیٹے کے نام طنز کر کے وہ نوجوانوں کو مغربی تہذیب کے بہاؤ میں بہنے سے روکنا چاہتے تھے:

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو عید کی پرواہ نہ رہی
کیک کو چکھ کے سیوئیوں کا مزا بھول گئے
بھولے ماں باپ کو اغیار کے چرچوں میں وہاں
سایۂ کفر پڑا ، نورِ خدا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

مسلمانوں کی بے عملی اور بے حسی کا نقشہ انھوں نے ایک قطعہ میں پیش کیا ہے کہ وہ مذہب کی حمایت میں بڑی بڑی باتیں تو کرتے ہیں لیکن جب عمل کی بات آتی ہے تو وہ اپنی کہی ہوئی باتوں پر خود عمل پیرا نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ ترک مذہب کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس قطعہ یعنی فرضی لطیفہ میں اکبرالہ آبادی نے مسلمانوں کی اسی بے عملی کو دکھایا ہے کہ جب لیلیٰ کی ماں مجنوں سے کہتی ہے اگر تو محنت کر کے ایم اے پاس کرے تو میں لیلیٰ کی شادی تجھ سے کر دوں، مگر مجنوں یہ سن کر کہتا ہے کہ محنت و مشقت عاشق کے لیے بکواس ہے۔ اگر لیلیٰ کو حاصل کرنے کی یہی ایک شرط ٹھہری تو میں لیلیٰ کے عشق سے دستبردار ہوتا ہوں۔ مسلمانوں کا حال بھی بالکل مجنوں جیسا ہے کہ وہ دین سے محبت کا زبانی دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب عمل اور قربانی کی بات آتی ہے تو وہ اپنے دین و مذہب کو الوداع کہنے کو تیار ہو جاتے ہیں:

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو اُن کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے و لیکن سعی کے پاس

الغرض اکبرالہ آبادی نے اپنے اسلوب اور مواد دونوں ہی کو طنزیہ حربے کے طور پر استعمال کر کے سماج میں پروان چڑھ رہی برائیوں کو دور کرنے کی حسب مقدور کوشش کی۔ فنکارانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ ان کی بے پناہ خلوص و دردمندی نے ان کی شاعری کو وہ عظمت عطا کی کہ اس میدان میں آج تک کوئی ان کا مدمقابل نہ ہو سکا۔

☆☆☆

اکبرالہ آبادی کے افکار وتصورات، ایک جائزہ

ڈاکٹر مامون رشید

ڈاکٹر مامون رشید شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔آپ نے ۲۰۱۱ء میں ''عربی تنقید کا اثر اردو تنقید پر'' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا، جواب کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے۔عربی شعریات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور اردو کی کلاسیکی شاعری پر آپ کو دسترس حاصل ہے۔اس کے علاوہ ۲۰۱۶ء میں افسانوں کے تجزیوں پر مشتمل کتاب ''افسانے کی عملی تنقید'' بھی اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ بیک وقت اردو، عربی، انگریزی اور ہندی زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں۔

E-mail Id: mamoon.urdu.amu@gmail.com / Mobi:- 9358008708

اکبرالہ آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۱ء) کا شمار انیسویں صدی کی ان عظیم شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے مسلمانوں میں علمی، سیاسی اور مذہبی بیداری پیدا کرنے کے لیے اپنے اشعار کو وسیلہ اظہار بنایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے مغرب و مشرق کی کشمکش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ایک طرف سرسید کی تحریک تھی جو مغربی تعلیم اور مغربی افکار میں نجات کی متلاشی تھی اور دوسری طرف اکبر کے علمی وسیاسی افکار تھے جو مشرقی تصورات کے احیا کے مبلغ تھے۔سرسید جدید مغربی تعلیم اور علوم وفنون کو مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے ضروری تصور کرتے تھے۔ان کے نزدیک مسلمانوں کی پسماندگی، جہالت اور غربت دور کرنے کا واحد ذریعہ جدید تعلیم تھا لیکن بعض لوگ سرسید کے اس خیال سے متفق نہیں تھے، اور سرسید پر طعن وتشنیع کے ساتھ طرح طرح کے الزامات عائد کرتے تھے۔جو باتیں اور شکایتیں سرسید اور ان کی تحریک کے مخالفین نے اپنی تقریر وتحریر میں کیں، وہ زیادہ بااثر نہیں ثابت ہوئیں اور سرسید اپنا کام کرتے رہے لیکن، وہی باتیں جب اکبر نے اشعار کی شکل میں طنزیہ اور ظریفانہ انداز میں پیش کیں تو انھیں بے حد پسند کیا گیا۔سرسید کو یہ علم تھا کہ ہر نئی تحریک اختلافات کی آغوش میں ہی پرورش پاتی ہے، اس لیے وہ اپنا کام کرتے رہے۔ اکبر نے سرسید اور ان کی تحریک کی تنقید، مخالفت اور طعنہ زنی کو اپنا مقصد حیات بنالیا تھا اور ساری زندگی اسی میں گزار دی۔گویا اکبرالہ آبادی کی شاعری سرسید کی تحریک کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی۔ وہ سرسید کے اصلاحی کاموں کے خلاف احتجاج وناراضگی کو طنزیہ پیرایے میں بیان کرتے ہیں۔اکبر نے اپنی مزاحیہ شاعری کے توسط سے مقصدی اور اصلاحی کام لیے انھوں نے شاعری کے ذریعہ مذہب، عقائد اور قدیم تہذیب وتمدن کی احیا وبقا کے لیے جو کام کیے وہ سرسید کی اصلاحی تحریکوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔

سرسید انگریزوں اور ان کی تہذیب وتمدن سے مرعوب تھے۔ان کے خیالات، نیچرل ازم، عقلیت پسندی، یورپ کی تقلید کی وجہ سے جو لوگ سرسید کی مخالفت میں اترے ان میں اکبر کا نام اہم ہے۔سرسید بھی مسلمانوں کی بھلائی اور بہتری چاہتے تھے، ان کے مخالف اکبر کا مطمح نظر

بھی اصلاحی تھا لیکن سرسید کے برعکس اکبر نے مشرقی عینک سے ہر چیز کو دیکھا۔ مشرق کی ہر ادا سے محبت اور یورپ کی ہر اچھی بری چیز سے نفرت کی۔ مغربی تہذیب، مغربی معاشرت اور سیاست پر وار کرنے کے لیے مزاح اور طنز وظرافت کو نہایت موثر اور فنکارانہ انداز میں استعمال کیا۔ مغربی تعلیم کے سبب نئی نسلوں میں قدیم مشرقی اقدار حیات سے جو نفرت سی پیدا ہوگئی تھی، اکبر اس کے مخالف تھے۔ اسی لیے جدید تعلیم یافتہ گروہ کے خیالات، اطوار و عادات اکبر کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے کیوں کہ یہ گروہ اپنے قابلِ احترام ماضی سے رشتہ منقطع کرتا اور مغرب کی ذہنی غلامی پر نہایت وفاداری کے ساتھ کربستہ اور پرعزم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے لیے وہ علم بے فائدہ ہے جو سرکاری نوکری تو دے مگر اللہ اور اس کے دین سے منحرف کردے۔ ان کے عہد میں مسلمان اسی فعل کے مرتکب ہو رہے تھے۔ لہٰذا اکبر سے برداشت نہیں ہوا اور مسلمانانِ ہند کے مغرب زدہ طبقے پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا:

عمل ان سے ہوا رخصت عقیدوں میں خلل آیا
کوئی پوچھے کہ ان کے ہاتھ کیا نعم البدل آیا

ان کی نظموں میں برق کلیسا، بنائے ملت، اپنے فرزند، غم ملت، تغیر عظیم، جلوہ دربار دہلی، دنیا کی بے ثباتی، حالت قوم، مشورہ، آمد بہار اور قول درست اہم ہیں۔ اکبر اپنی نظم مشورہ میں کہتے ہیں:

پستی قوم کے جب آگئے دن اے اکبر
اونچے درجوں میں ہوئے دین کے دشمن پیدا
کون کہتا ہے تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے نہ کر حسرت لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول
راہ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد ہندوستان ایک عجب کشمکش سے دوچار تھا اور انگریزوں کے تسلط کے بعد ہندوستانیوں نے مغربی طور طریقوں اور تہذیب و تمدن کو اپنانا شروع کردیا تھا لیکن اکبر نے ان تبدیلیوں کو فوری طور پر نہیں اپنایا بلکہ اپنے شعور وادراک سے ان تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور چھوٹے بڑے مسائل کو کبھی طنز و مزاح کے لہجے میں اور کبھی ان تبدیلیوں کا مضحکہ اڑا کر اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اکبر الہ آبادی کو خدشہ تھا کہ کہیں یہ ہندوستانی اپنی قدیم مذہبی روایات کو فراموش نہ کردیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی شاعری سے اس عہد کی انتہا پسندیوں اور ناہمواریوں کو اعتدال پر لانے کی سعی کی اور مغربی طرز معاشرت کو طنز کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے اس دور میں تبدیل ہوتی ہوئی معاشرت کے ہر پہلو پر کڑی نظر رکھی اور شدت سے اس کی مخالفت کی۔ اس کے لیے انھوں نے نظم کے پیرایہ کو اپنایا اور نظم نگاری کی مروجہ روایات سے ہٹ کر ہندی، انگریزی اور عام ضرب الامثال کا استعمال کر کے اپنی شاعری کو افادی اور اصلاحی پیکر میں ڈھالا۔

اکبر نے برٹش حکومت اور اس کی پالیسیوں کا مذاق بھی طنزیہ انداز میں اڑایا ہے۔ ان کی شاعری میں انگریزی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف شدید ردعمل ملتا ہے۔

وہ ایک پکے مسلمان تھے مگر مذہبی ناروا داری اور عصبیت سے کوسوں دور تھے۔ ان کی مذہب کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار نظام الدین اولیا میں جا کر خواجہ حسن نظامی کے مہمان ہوئے۔ درگاہ کے دروازے پر غالب کی مزار تھی، خواجہ صاحب نے بتایا تو ان کے ساتھ فاتحہ پڑھنے چلے مگر کچھ ہی فاصلہ طے کر کے رک گئے اور کہنے لگے کہ:

"میں نہیں جاؤں گا یہ تو وہی شخص ہے جو جنت کے لیے یہ شعر کہہ گیا ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایسے شخص کی قبر پر میں فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔ اللہ میاں اس کے ساتھ جو بھی چاہیں معاملہ کریں۔"

اکبر تصوف کے بڑے معتقد تھے لیکن ان کا تصوف بھی خالص اسلامی طرز کا تھا۔ پیرزادوں اور درگاہ کے مجاوروں والا نہ تھا۔ عرس، سماع سے اجتناب کرتے اور کشف وکرامات کے بھی کچھ زیادہ قائل نہ تھے، بس توحید کا رنگ غالب تھا۔ نماز اول وقت میں پڑھنے کا خاص اہتمام رکھتے۔ بار بار گھڑی دیکھتے جیسے کوئی عازم سفر اسٹیشن جانے کے لیے گھڑی دیکھتا رہتا ہے۔ نماز کے بعد تلاوت قرآن مجید کے شائق تھے۔ وہ دن میں دو وقت پابندی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔

سرسید مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب وتمدن کو مسلمانوں کی کامیابی اور ترقی کا موثر ذریعہ گردانتے تھے جبکہ اکبر خالص مشرقی تہذیب کے پروردہ تھے اور مغرب کی ہر چیز کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ سرسید اور ان کی تحریک سے واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ان کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں قوم کا تہذیبی سرمایہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اکبر کو سرسید کے مذہبی نظریات وعقائد سے اسی بات پر اختلاف تھا کیونکہ سرسید جس طرح مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں اور انگریزوں کو قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے اکبر اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے اسلامی تشخص کو اہمیت دیتے تھے اور اسلامی تہذیب وتمدن میں کسی قسم کی تبدیلی کے قائل نہیں تھے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

عقائد پر قیامت آگئی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

اس شعر میں اکبر نے مغربی معاشرت اور جدید تعلیم کے نتیجے میں عقائد اسلامی سے مسلمانوں کی بے اعتنائی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ان کے نزدیک عقائد سے یہ دوری جدید تعلیم کا اثر ہے۔ اکبر کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں جدید تہذیب کے چند مناظر سے خاص تکلیف ہوتی تھی مثلاً عورتوں کی تعلیم، ان کی بے پردگی، مردوں کی مجلسوں میں عورتوں کی شرکت، مغربی لباس، مغربی طرز کی دعوتیں، کلب اور دیگر عیش وعشرت کے مظاہر۔ ایک زمانہ تھا جب پردہ نہ کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا، لیکن جب رہن سہن اتنا تبدیل ہوا کہ پردہ کرنا معیوب سمجھا جانے لگا، تو اکبر کہہ اٹھے:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو آپ کا ہے وہ پردہ کہاں گیا
کہنے لگیں کہ عقل پر مردوں کی پڑ گیا

اس میں بھی عقائد سے دوری کا شکوہ ہے۔ شعائر اسلام سے عدم دلچسپی پر چوٹ ہے اور جدید تعلیم کے مسلمانوں کے مذہبی رجحانات پر پڑنے والے منفی اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اکبر مذہبی اقدار کی پاسداری کرنے والے انسان تھے۔ وہ جس تہذیب کا قیام عمل میں لانا چاہتے تھے، سرسید کے خیال میں وہی تہذیب مسلمانوں کی ترقی میں سد راہ تھی۔ سرسید کے نزدیک قدیم طرز پر چلی آرہی ہماری نشست و برخاست کے اصول، کھانا پینا، گفتگو، رسم ورواج سب ہی تو قابل اصلاح اور قابل نفرت تھے۔

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

اس قسم کے تمام اشعار میں اکبر نے بڑی شدومد کے ساتھ سرسید پر اعتراض کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس بات سے بھی بہت نالاں تھے کہ ان کا بیٹا عشرت بھی سفر یورپ کے نتیجے میں جدید خیالات کا حامی ہوگیا تھا۔ اکبر خود شعرگو اور شعرفہم تھے لیکن مذہبیت ان پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ غالب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے سے رک گئے۔ ایسا شخص سرسید احمد خاں کے ان نیچری خیالات سے کس طرح صرف نظر کرسکتا ہے، جن میں واضح طور پر جنت، دوزخ اور فرشتوں کے بارے میں وہ وہ تاویلیں کی گئی ہیں جن کو علما تو کیا عام مسلمان بھی ناپسند کرتے تھے۔ سرسید پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سمجھا ہے تونے نیچر و تدبیر کو خدا
دل میں ذرا اثر نہ رہا لاالٰہ کا
شیطان نے دکھاکے جمال عروس دہر
بندہ بنادیا ہے تجھے حب جاہ کا

درج بالا اشعار میں اکبر کا متشددانہ مذہبی انداز عروج پر نظر آتا ہے کیونکہ سرسید نے کبھی یہ نہیں کہا کہ راحت دنیا مقدم ہے۔ انھوں نے تو تمام آسائشیں حاصل ہوتے ہوئے راحت دنیا کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تھا۔ البتہ یہ سچ ہے کہ وہ مذہب یا رواج میں کسی ایسی بات کو قبول نہیں کرتے تھے جو جدید تعلیم کی عطا کردہ عقلیت سے متصادم ہو۔ سرسید نے جنت، دوزخ، فرشتے وغیرہ کی عقلی توجیہات کی تھیں وہ یقیناً آج بھی بالعموم تمام مسالک کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں لیکن ان غیر حقیقی توجیہات کا مقصد مذہب سے فرار، دنیاوی راحت کا حصول یا کسی کو خوش کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے پیچھے بھی ان کا یہ جذبہ کارفرما تھا کہ مسلمان تشکیک سے نکل کر مذہب اسلام پر ثابت قدم رہ سکیں۔ چنانچہ سرسید احمد خان لکھتے ہیں:

”ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ پس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون کے دیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لاویں مگر یہ خیال ہو کہ ان دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے۔“ (مقالات سرسید)

اکبر اور سرسید مذہبی نظریات میں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ اکبر پرانی سوچ کے اس حد تک نمائندہ تھے کہ وہ ہر بات مذہب کے حوالے سے کہتے اور سمجھتے تھے۔ ہر بات مذہب سے شروع کرکے مذہب پر ختم کرنا چاہتے تھے۔ وہ سرسید کی نیچری فکر سے پریشان تھے اور اس سے زیادہ اس بات نے ان کو پریشان کردیا تھا کہ لوگ سرسید کی آواز پر لبیک کہہ کر ان کی طرف کھنچے چلے جارہے تھے۔ اکبر کو مغرب اور مشرق کا ملاپ اس اعتبار سے قطعاً ناپسند تھا کہ لوگ مغرب کی اندھی تقلید میں مذہب سے دور ہوتے جارہے تھے بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مغربی معاشرت کے وکیل اپنے دام میں پھنسا کر مذہبی جذبات سرد کرتے جارہے ہیں۔

کہتی ہے یہ ہسٹری باآواز بلند
تم کچھ نہ رہے اگر مسلمان نہ رہے

اس عہد میں سائنس نے ترقی اور دنیوی آسائشوں میں تو ضرور اضافہ کیا لیکن سائنس کی مذہب کی طرف یلغار نے ہر مکتبۂ فکر کے نمائندوں کو پریشان کررکھا تھا۔ چنانچہ سرسید نے اپنے مذہب کو سائنٹفک مذہب ثابت کرنے کے لیے بعض متفقہ مسائل کی سائنسی

تاویلات کرنی شروع کیں، جو عام لوگوں کے لیے قابل قبول اور مستفید تھیں۔ اکبر نے بھی سائنسی یلغار کو محسوس کیا اور اس پر بھرپور بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

کفر نے سائنس کے پردے میں پھیلائے ہیں پاؤں
بے زباں ہے بزم دل میں شمع ایماں ان دنوں

اس انتشار کے دور میں سرسید نے اپنی دور اندیشی کے سبب مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے مغرب کی روشن خیالی کو اختیار کر کے مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جب کہ اکبر نے مغربی تہذیب و تمدن اختیار کرنے کے پس پردہ مذہب سے بیزاری کے رجحان پر دکھ کا اظہار کیا۔

تحقیر مولوی کی نہ کر اے گریجویٹ
واللہ اب بھی فرد ہے یہ اپنے ڈھنگ میں

اکبر ایک پڑھے لکھے انسان تھے اور معزز سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ انھیں انگریزی زبان پر بھی خاصا عبور تھا، انگریزی اخبارات اور انگریزی کتابیں بھی پڑھتے تھے۔ اگرچہ وہ مذہبی اعتقادات میں خاصے متعصب اور متشدد تھے لیکن عملی زندگی میں کسی بھی پرعزم انسان کی طرح آگے بڑھنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ انھوں نے وکالت سے عملی زندگی کا آغاز کیا، پھر منصف ہوئے، سب جج ہوئے، بعدازاں عدالت خفیہ کے جج، ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہوئے اور ہائی کورٹ کی ججی کی منزل تک پہنچتے پہنچتے رہ گئے۔ وہ تعلیم کی اہمیت بالخصوص جدید تعلیم کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی قدیم ثقافت نئی قوتوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو ضرور ایسی صورتیں ظہور میں آتی ہیں جو بعض اوقات المناک ہوتی ہیں اور بعض اوقات مضحکہ خیز۔ بنیادی طور پر وہ نئی تعلیم کے خلاف نہیں تھے مگر برعظیم میں اس تعلیم کا جو سانچہ وجود پذیر ہوا اس کے فطری نقائص کی طرف سے وہ بہت حساس تھے۔ ان میں سے بہت سے نقائص سے خود ماہرین تعلیم بھی واقف تھے۔

راہ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے
واں نہ پہنچے اور ہم سے چھٹ گئے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون ''سرسید اور اکبر'' میں دونوں کی اصلاحی کاوشوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سرسید ایک انقلاب لانا چاہتے تھے لا کر رہے۔ اکبر اس انقلاب کے زور کو کم کرنا چاہتے تھے کم کر کے رہے، ظاہر ہے کہ اپنے مشن میں دونوں کامیاب رہے اور دونوں کے مشن سے ہماری تہذیبی اور سیاسی زندگی متاثر ہوئی بلکہ اگر ہم برصغیر کی سیاسی و ملی تحریکوں اور تعلیمی و تہذیبی تنظیموں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان پر جتنا گہرا اثر اکبر کے مسلک کا ہے، سرسید کے مسلک کا نہیں ہے۔ مولانا شبلی، حالی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور سید سلیمان ندوی جنھوں نے مسلمانوں کے دینی و ملی شعور پر گہرا اثر ڈالا ہے، سب کے سب سرسید سے کہیں زیادہ اکبر کے خیالات سے متفق و متاثر ہیں۔''

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری، سرسید اور اکبر الہ آبادی، ص ۱۷۱-۴)

اکبر چاہتے تھے کہ ان کی تعلیمات میں مذہبی تعلیم نیز اخلاقی تربیت کا ایسا سلسلہ جاری ہونا چاہیے جو مسلم طلبا کا اسلامی تشخص قائم رکھے لیکن یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ وہ سرسید کے مدرسہ اور ان کے طریقہ تعلیم کے یکسر خلاف تھے۔ شیخ اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

''سید اکبر حسین ابتدا میں سرسید کے معترضین میں سے تھے اور ان کے خلاف اودھ پنچ میں لکھا کرتے تھے مگر پھر مخالفت چھوڑ دی تھی اور معتقد بن گئے تھے۔''

(مکتوبات سرسید (جلد اول)، سرسید احمد خان، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، ص:۴۳)

اکبر اپنے تمام مذہبی، تعلیمی وقومی نظریات کے باوجود مغربی تعلیم کے سرے سے مخالف نہیں تھے۔ ان کو اگر سرسید کے مدرسہ اور سرسید کی رائج کردہ تعلیم سے اختلاف تھا تو وہ محض اس کے تہذیبی اثرات کے حوالے سے تھا اور سچ یہ ہے کہ صرف اعتراض ہی تھا، اس کا کوئی واضح حل یا ایسی متبادل شکل وہ سرسید کو نہ دے سکے جس سے جدید تعلیم کے بیان کردہ نقائص کا ازالہ کیا جا سکے۔ ۱۸۶۹ء میں جب سرسید کو ستارۂ ہند (سی ایس آئی) کا خطاب دیا گیا تو اکبر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فضل خدا سے عزت پائی آج ہوئے ہم سی ایس آئی
شیخ نہ سمجھے لفظ انگریزی بولے ہوئے بھی عیسائی

آخر میں اکبر نے سرسید سے موافقت کا اظہار کیا ہے اور اعتراف کرتے ہیں کہ ہم تو باتیں کرتے رہے لیکن سرسید نے تعلیمی میدان میں ٹھوس اقدامات کیے۔ سرسید کے انتقال کے بعد وہ علی گڑھ سے اپنے تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں:

بعد سید کے کالج کا کروں کیا درشن
اب محبت نہ رہی اس بت بے پیر کے ساتھ

درج بالا شعر میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے، اسی کے تناظر میں مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

''انھوں (اکبر) نے سرسید کے خلوص کے اعتراف کے ساتھ ان کی تعلیمی سیاست، تقلید مغرب کی پرجوش دعوت اور کالج کی مغربی زندگی اور فضا پر بیباکانہ مگر لطیف انداز میں تنقید کی جس میں مغرب کی اندھی تقلید، عقائد میں کمزوری، دین میں ڈھیلے پن، نوجوانوں کی تن آسانی ان کے بلند معیار زندگی، فیشن پرستی، اہل دین سے وحشت، ملازمتوں پر انحصار، قدیم مشرقی تہذیب اور اس کی روایات اور خصوصیات سے بغاوت، مغربی معاشرہ میں فنائیت اور خالص مادی طرز فکر کو خوب نمایاں کیا۔''

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، سید ابوالحسن علی ندوی، ص:۱۰۶)

اکبر کو بجا طور پر تعلیم کے میدان میں سرسید کے ذریعہ اٹھائے گئے قابل قدر اقدام کا اعتراف تھا۔ اکبر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جہاں سرسید کے کاموں کو قابل تحسین قرار دیا، وہیں مدرسۃ العلوم کو امداد بھی دیتے رہے۔ سرسید کا خط بنام اکبر الہ آبادی سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۷ر جولائی مع مبلغ دو سو روپیہ اور چندہ مدرسۃ العلوم متعلق بلڈنگ فنڈ پہنچا۔''

(مکتوبات سرسید (جلد اول)، سرسید احمد خان، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی ۴۴)

اکبر کا مدرسۃ العلوم کو چندہ دینا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ سرسید کی تعلیمی پالیسی کے ایسے کھلے دشمن نہیں تھے جیسا کہ اپنی طنزیہ شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اکبر اور سرسید کا بنیادی مقصد قوم کی اصلاح کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر اپنے دور کی عظیم ہستی (سرسید) کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق ہے جو کہنے والے کرنے والے میں
واہ رے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا
یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کو اوج ہو منظور خدا خواہ نہ ہو
غیر ممکن ہے کہ دنیا میں تیری واہ نہ ہو

بظاہر اکبر کا سرسید سے شدید سیاسی اختلاف تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکبر کو محض سرسید کے سماجی اور تہذیبی نظریات پر اعتراض تھا۔ اکبر

مسلمانوں کو قدیم ہندوستانی طرز تمدن اور ہندوؤں کو قدیم ہندوانہ طرز معاشرت میں دیکھنا چاہتے تھے تا کہ ان کا تشخص قائم رہے، جبکہ سرسید ہندوستانیوں کو مغرب کے رنگ میں رنگ دینا چاہتے تھے۔اس کے علاوہ سیاسی نظریات میں دونوں کے خیالات بہت حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔وہ انگریزی حکومت میں ملازمت کرنے کو برانہیں سمجھتے تھے۔اس اعتبار سے ان کی اور سرسید کی فکر یکساں تھی۔ان کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں اپنے مذہبی اقدار کو مقدم رکھیں۔دنیا کے رنگ اور رفتار کو دیکھ کر وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ دور جدید میں ایسا کرنا مسلمانوں کے لیے بہت مشکل ہے۔برصغیر کے مسلمان جس طرح جدید روشنی کے رنگ میں ڈھلتے جا رہے تھے، اس پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اب تو ہے عشق بتاں میں زندگانی کا مزا
جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائے گا

اکبر کی نظر میں وہ لوگ قابل تعریف وتحسین ہیں جوان حالات میں بھی اپنے آپ پر جبر کر کے مغربی تہذیب سے خود کو بچائے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی مغرب کی زہرناک تہذیب سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اکبر کے قول وفعل کا تضاد اس وقت نظر آتا ہے جب انھوں نے خود اپنے بیٹے عشرت کو جدید تعلیم کے حصول کے لیے لندن بھیجا۔اگر اکبر کے تعلیمی نظریات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغربی تعلیم کے کلیتاً مخالف نہیں تھے بلکہ ان کا اختلاف اس تعلیم سے تھا جس کے زیر اثر الحادی خیالات درآتے ہیں۔اکبر کے یہ خدشات کسی طرح غلط نہیں تھے خود ان کے بیٹے نے وہ انداز رہن سہن اور انداز فکر اختیار کیا جس کو دیکھ کر اکبر کو کہنا پڑا:

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے

بلاشبہ اکبر نے اردو نظم کو طنز ومزاح کے نئے امکانات سے روشناس کرایا۔اکبر کی شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار ہے۔بنیادی طور پر ان کی شاعری کا موضوع مغربی تہذیب کی تنقید ہے۔وہ مغربی تہذیب و تمدن کی یلغار سے ملت کی پامالی نہیں دیکھ سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ماضی میں پناہ لی، قدیم روایات کو سینے سے چمٹائے رکھا اور مسلم قوم کو اپنے ماضی کی روایات فراموش کر کے انگریزی لباس، مغربی آداب زندگی، زبان اور تصورات کی کورانہ تقلید سے روکنے پر اصرار کیا۔وہ خود انگریزی داں تھے اور کبھی انگریزی تعلیم سے منع نہیں کیا بلکہ انگریزی تعلیم وتہذیب کے مضر اثرات سے اجتناب کرنے کی تلقین کی۔اکبر نے مسلمانوں کے علم حاصل کرنے پر اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ اُس علم سے پڑنے والے مغربی تہذیب کے منفی اثرات کے معترض ہیں۔اپنے کلام میں انھوں نے ان اثرات کے خلاف حتی الوسع بغاوت کا نعرہ بلند کیا۔

☆☆☆

اکبرالہ آبادی کے فارسی کلام کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر علی بیات

ڈاکٹر علی بیات (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف تہران، ایران) نے پنجاب یونی ورسٹی، پاکستان سے ایم۔اے، اردو اور پی ایچ ڈی کیا ہے۔ چھ زبانوں کے ماہر ہیں۔ ۲۰۰۴ء۔۲۰۰۵ء میں آپ طہران یونی ورسٹی کی لائبریری کے چیف لائبریرین رہ چکے ہیں۔ ۲۰۰۵ء۔ ۲۰۰۶ء اور ۲۰۱۳ء۔ ۲۰۱۷ء کے درمیان شعبۂ اردو، طہران یونی ورسٹی کے صدر کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر کئی سیمنار میں مدعو کیے جا چکے ہیں۔ اردو اور فارسی لغت "زیب اللغات" ترتیب دیے ہیں۔

Email : bayatali@ut.ac.ir / Mob: +98 9128601306

غدر کے زمانے تک اکبر نے انگریزی کی ایک دو کتابیں پڑھی تھیں۔ گھر پر کچھ فارسی، عربی اور ریاضی میں استعداد بہم پہنچائی تھی۔ پھر کچھ مدت تک مولوی محمد فاروق چڑیا کوٹی کے درس میں بھی شرکت کی تھی۔ اکبر کے حصول تعلیم کا یہ تمام زمانہ چار پانچ برسوں تک محیط ہے۔ انھوں نے اس کے بعد ذاتی مطالعہ ہمیشہ جاری رکھا اور وفات تک مختلف علوم کی دقیق کتابوں کے مطالعے میں منہمک رہے۔ سید عشرت حسین لکھتے ہیں:

> "حضرت قبلہ نے مسلسل مطالعے سے کتنی قابلیت بڑھائی، اس کا اندازہ عربی، فارسی اور انگریزی کی ان کتابوں سے ہو سکتا ہے جو حضرت قبلہ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔"(1)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب سے ماخوذ اس اقتباس سے اکبر کی تعلیم کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ دیگر علوم کی تعلیم کا تو مختصر ذکر ہے، لیکن ان کی فارسی تعلیم کا سرے سے ذکر نہیں۔ تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اکبر اپنے دور کی عام تعلیمات کے مطابق، کسی مولوی سے عربی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی ہوگی اور بعد میں اپنے ذاتی مطالعے سے اس زبان میں ایسی مہارت حاصل کی ہوگی، جس کی وجہ سے اتنی خوبصورتی سے فارسی شاعری بھی کی ہے۔

اکبر کی فارسی شاعری کی الگ کلیات یا دیوان نہیں۔ شاید اس لیے کہ ان کے فارسی کلام کی مقدار اس قدر نہیں ہے کہ وہ ان کو الگ مجموعے میں شامل کرتے۔ البتہ میرے نزدیک، اکبر کا فارسی کلام اس قابل ہے کہ جس پر ایک مفصل تحقیقی و تنقیدی مقالہ لکھا جائے۔ ایک سرسری نظر میں ان کی اردو کلیات کے اندر ہی ان کا فارسی کلام، چند صورتوں میں نظر آتا ہے:

1- وہ غزلیں یا قطعات جو خالص فارسی میں ہیں۔

2- وہ اردو غزلیں یا قطعات جن کے ایک یا چند مصرعے اردو میں ہیں۔ ان کے فارسی کلام کو بہ لحاظ موضوع بھی کم از کم دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1- وہ کلام جو سنجیدہ مضامین پر مشتمل ہیں۔

2- وہ فارسی کلام جو اکبر کے اردو طنزیہ کلام کی خصوصیات کے حامل ہیں۔

نیز ان کے فارسی کلام کو ذیل کی دو صورتوں میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1- وہ فارسی کلام جو طبع زاد ہیں۔ یعنی کسی فارسی شاعری کی تتبع میں نہیں لکھے گئے ہیں۔

2- وہ فارسی کلام جو فارسی کے مشہور شعرا کے کلام کی پیروڈیاں ہیں یا ان کے وزن و بحر میں ہیں۔

اس مختصر مقالے میں ان ہی عنوانات اور تقسیمات کے ذیل میں اکبر کی فارسی شاعری کے بارے میں کچھ معروضات پیش کیے جائیں گے۔ ان تقسیمات کے بعد ان کی فارسی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کے بارے میں مختصر بحث کی جائے گی۔ ایک بات اظہر من الشمس ہے کہ اکبر نے بلا تردید اپنی شاعری میں بیشتر اس وقت کے ہندوستان کی معاشرتی برائیوں، مغربی تہذیب اور لادینیت کو اپنے طنز و مزاح اور تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ذیل کا قطعہ دیکھیں جو اکبر کے سنجیدہ فارسی کلام کے زمرے میں تو ہے لیکن فارسی شاعری کی تتبع میں لکھے گئے کلام کے ذیل میں اس کا ذکر ضروری ہے:

ملحدان راهمه اوصاف و ثنا ها خوانند
مؤمنان را بجز اشند به دشنامے چند
غیرت دین بفروشند به یک غمزه کفر
چشم پوشند ز ملت پئے خودکامے چند
روح خود را چو سپردی به غلامی حریف
چه کنی ناز به نامے و به خدّامے چند
پخته وضعے که خدا عقل و تمیزشداوست
قدمے همن نهد در ره این خامے چند
ورد این نغمه حافظ کن و خوش باش اکبر
هان تو از باده شیراز بزن جامے چند
اے گدایان خرابات خدا یار شماست
چشم اِنعام مدارید ز اَنعامے چند(2)

اس قطعہ بند نظم کا وزن و بحر اور ردیف و قافیہ، حافظ شیرازی کی ایک غزل جس کا مطلع یوں ہے:

حسب حالی ننوشتی و شد ایامی چند
محرمی کو که فرستم به تو پیغامی چند(3)

ترجمہ: اپنے احوال کے بارے میں نہ لکھا اور کئی دن گزر گئے۔ کوئی ایسا محرم کہاں ہے کہ تجھے کچھ پیغام بھیجوں۔

اکبر نے مقطع میں اسی غزل کا ایک شعر بھی عیناً درجکر کے صنعت تضمین کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس نظم کا مضمون معاشرتی امور اور معاشرتی خرابیوں کا ذکر ہے۔ یعنی اِس دور کے ہندوستان میں ملحدوں اور کفار کی تمجید و تعریف کی جاتی ہے، جب کہ مسلم اور مومن لوگ دشنام طرازیوں کا سامنا ہے۔ کافر کی ایک نگاہ غمزۂ آلود پر مسلم اپنا دین بیچتے ہیں اور ملت اسلامیہ کو چند دنوں کے عیش و آرام کے لئے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بات اسی طرح جاری رہتی ہے تا کہ حافظ شیرازی کے ایک شعر سے وہ اپنا آخری پیغام یوں سناتے ہیں:

اے گدایان خرابات خدا یار شماست
چشم اِنعام مدارید ز اَنعامے چند

ترجمہ: ”شراب خانے کی گداؤ! خدا تمھارا مددگار ہے۔ چند حیوانوں سے اِنعام کی امید نہ رکھو۔“(4)

اکبرالہ آبادی نے حافظ کی اسی غزل کے وزن و بحر میں ایک اور قطعہ بند نظم لکھی ہے:

گفتمش تارک مذہب شوم و خوش باشم
منصبے چند ہوس دارم و اَنعامے چند
خلق را فائدہ نیست از این جنگ و جدال
یک دعا ہست درین محفل و دشنامے چند
گفت خاموش که دین است مدار ملت
ترک این راہ مکن از پے خودکامے چند

عیب مذہب ہمہ گفتی ہنرش نیز بگو
نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند (5)

اس قطعے کے ہر شعر میں ایک انوکھی بات کا ذکر ملتا ہے۔ پہلے شعر میں طنزیہ انداز میں یہ کہا گیا ہے کہ چون کہ مجھے انعام اور تحفوں کا ہوس ہے، اس لئے سوچا ہے کہ یہ بہتر ہے کہ میں مذہب کو خیرباد کہوں۔ شاید اس بات کے پردے میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مذہب کے حقیقی ماننے والے دنیوی عہدوں اور انعام کی لالچ میں مذہب کو ترک نہیں کرتے ہیں۔ نیز تیسرا شعر اس لحاظ سے کہ ایک سنجیدہ بات پرمبنی ہے، بہت غور طلب ہے کہ ملت اسلامیہ کا مدار و مدار دین پر ہے، اس لئے اس زیادہ کچھ بات نہ کر اور خاموش رہ اور کچھ خودکامگی کے لئے اس راستے کو مت چھوڑو! اکبر نے آخری شعر اس مقطعے میں اس لحاظ اور اہم ہے کہ حافظ شیرازی کی مذکورہ بالا غزل کے ایک مشہور شعر جو کہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، میں ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ اپنا عندیہ بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ذرا حافظ کا شعر دیکھیے:

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو
نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

یعنی: تو نے شراب کی بُرائیاں تو سب بیان کر دیں، اس کی اچھائیاں بھی بیان کر۔ چند عام آدمیوں کی دلجوئی کی خاطر حکمت سے انکار نہ کر۔ (6) اکبر نے ایک لفظ کی تبدیلی سے جہاں پیروڈی کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے، وہاں طنزیہ بیان میں مذہب کے مخالفوں کا منہ توڑ جواب بھی دیا ہے۔ ایک اور قطعہ بند نظم ملاحظہ کیجیے جس کا پہلا شعر یوں ہے:

ناقصان را سود بخشد پرتو اہل کمال
ماہ نو رامی کند در نور، کامل آفتاب (7)

یعنی اہل کمال کے نور کی شعاعیں، غیر اہل کمال کو اس طرح نفع پہنچاتی ہیں، جس طرح سورج، ماہ نو کو مکمل طور پر نورانی کرتا ہے۔ یہ نسبتاً طویل نظم بھی ان کی سنجیدہ شاعری کے زمرے میں شامل ہو سکتی ہے۔ اسی نظم کے ایک شعر میں وہ کہتے ہیں:

سوز عشق روئے تو دارم با این ہمہ کم مایگی
اختر یہ ستم کہ پنہاں کردہ در دل آفتاب (8)

شاعر انکسار کا اظہار کر کے اپنے اپ کو مخاطب کے مقابلے میں اپنے آپ کو کم مایہ سمجھتا ہے لیکن یہ کہتا ہے کہ اس کے باوجود تمہارے عشق کی حرارت سے میرا دل مملو ہے۔ جس طرح اختر جیسی حقیر چیز نے اپنے دل میں سورج کا نور چھپایا ہو۔ اسی نظم کے آخری شعر میں تعلّی سے کام لیتے ہوئے اکبر نے یوں کہا ہے:

آفریں اکبر برین روشن بیانی ہائے تو
شعر می خوانی و میتابد بہ محفل آفتاب (9)

یعنی اے اکبر تیری روشن بیانیوں پر آفرین ہو۔ تو شاعری کرتا ہے اور اس سے محفل میں سورج کی شعاعیں بکھرتا ہے۔

اس نظم کے بارے میں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ اکبر نے اس نظم کو اپنی شاعری کے ابتدائی ادوار میں کہا ہے اور فارسی شاعری میں ان کی پختگی اور مہارت کو اس دور کے اہم فارسی گو شعرا کے کلام کا ہم پلہ کہا جا سکتا ہے۔ ایک فارسی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

غم ہجر تو چہ کردہ است بہ من ہیچ مپرس
گریہ می آیدم از رنج و محن ہیچ مپرس (10)

یعنی تیرے ہجر کے غم نے میرے ساتھ کیا کیا یہ مت پوچھ۔ اس قدر مجھے دکھ ہوا ہے کہ مت پوچھ۔ حافظ کی غزلیات میں بھی "مپرس"

کی ردیف کی تین غزلیں ہیں۔ اکبر کی غزل عشقیہ مضامین کے بیان میں بہت کامیاب ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

دقتے ہست بہ تشریح کمر ہیچ مگو
مشکلے ہست ز اسرار دہن ہیچ مپرس (11)

یعنی محبوب کی کمر کی تشریح میں دقت ہو رہی ہے، نیز اس کے منہ کے اسرار بیان کرنے میں بھی مشکل پیش آ رہی ہے۔ یہاں ایک بات کا ذکر ضروری ہے کہ فارسی میں ''دقت'' کا لفظ ''غور کرنے'' کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور اردو میں ''مشکل'' کے معنی میں۔ اکبر کے پیش نظر اس لفظ کا اردو مفہوم رہا ہے۔ غرض یہ ہے کہ فارسی قاری کو اس کے صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت پیش آ سکتی ہے۔ اس غزل کے ایک شعر میں اکبر کہتے ہیں کہ میرے دل میں کچھ حسرتیں ہیں، اس بارے میں یہ نکتہ ہی بس ہے کہ یہ طرز سخن میں نے کس سے سیکھا ہے، مت پوچھ:

حسرتے چند بہ دل دارم و این نکتہ بس است
وز کہ آموختہ ام طرز سخن ہیچ مپرس (12)

شاید اکبر اس شعر میں کسی خاص استاد سے سخنوری کی تعلیم نہ پانے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں یا درس عشق میں کسی خاص استاد سے عدم تعلیم کی بات بھی کرتے ہیں۔

اکبر نے جیسا کہ کہا گیا بعض فارسی اشعار کی پیروڈی لکھی ہے اور اس کو اس طرح طنزیہ مفہوم عطا کیا ہے۔ جس طرح مذکورہ بالا سطور میں حافظ کے ایک شعر میں ایک لفظ کو تبدیل کر کے اس شعر کی پیروڈی بنانے کی بات ہوئی، اسی طرح کے کئی فارسی اشعار حافظ شیرازی اور دیگر شعرا کے پیش کیے جا سکتے ہیں جن کی اکبر نے پیروڈیاں کہی ہیں۔ حافظ کی ایک غزل ہے جس کا مطلع درج ذیل ہے:

سحر بلبل حکایت با صبا کرد
کہ عشق روئے گل دیدی چہ ہا کرد

یعنی: ''صبح کے وقت بلبل نے صبا سے اپنی سرگذشت بیان کرتے ہوئے کہا: تو نے دیکھا، پھول کے عشق نے ہم سے کیا کیا؟''

(13) اکبر نے اسی غزل کے وزن و بحر میں ایک رباعی لکھی ہے:

سحر مسلم حکایت با صبا کرد
کہ تفسیرش بہ ما دیدی چہ ہا کرد
من از بیگانگان ہرگز ننالم
کہ با من ہر چہ کرد آن آشنا کرد (14)

اکبر نے حافظ شیرازی کے ایک شعر کے مصرعوں میں دو تین الفاظ کی تبدیلی سے اس کی معنویت اور پیغام کو تلخ طنز کے پیرائے میں تبدیل کیا ہے۔ کہ ایک مسلم صبح کے وقت باد صبا سے یوں بات کر رہا تھا کہ تو نے دیکھا کہ اس کی تفسیر نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟ اور رباعی کا دوسرا شعر حافظ کی مذکورہ غزل کا ایک شعر ہی ہے کہ

''مجھے بیگانوں سے قطعاً کوئی شکایت نہیں کہ مجھ سے جو کچھ کیا، اس دوست نے کیا۔'' (15)

اکبر فارسی اشعار کو طنز کی معنویت بخشنے کے لئے جہاں ان کی پیروڈی بناتے ہیں، وہاں جن الفاظ کو فارسی الفاظ کے بدل کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ کبھی کبھی اردو کے نہیں، انگریزی کے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین اکبر کے اردو کلام میں انگریزی الفاظ کے استعمال کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''اکبر کے کلام میں بلا مبالغہ سیکڑوں انگریزی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ان کے استعمال کی خاص وجوہ ہیں:

1- علی گڑھ کالج کی جماعت اور نئی تہذیب کے

پرستاروں پر طنز کرنے کے لیے ان الفاظ کا استعمال جو وہ اپنی بات چیت میں شامل کرتے ہوں گے۔

2- انگریزوں کی اس اردو کی نقل اتارنا جس میں انگریزی الفاظ چھڑکے ہوئے ہوتے ہیں۔

3- غیر ضروری انگریزی الفاظ کی ملاوٹ سے مزاح اور مضحکے کی فضا پیدا کرنا۔

4- بعض اوقات قافیہ پیمائی کی ضرورت۔"(16)

وہ اس بارے میں آگے جا کر یہ لکھتے ہیں کہ انگریزی والے اشعار، اکبر کے تہذیبی، مذہبی اور سیاسی نظریات کی مکمل آئینہ داری کرتے ہیں۔ واضح ہو جاتا ہے کہ اکبر شدید دین دار شخص تھے، جدید تہذیب و تعلیم کو مضر جانتے تھے......"(17) گیان چند جین کے اس اقتباس کے پیش نظر ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہیٹ رانہ بر سر من جائے دستار اے عزیز

مرد تا مسٹر تواند شد چرا قبلہ شود؟(18)

اس شعر میں "ہیٹ (Hat)" اور "مسٹر (Mr)" انگریزی الفاظ ہیں جو کہ مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر اکبر نے اس فارسی شعر میں استعمال کیا ہے۔ اس شعر کا مفہوم کچھ یوں کہ دستار کی جگہ میرے سر پر ہیٹ رکھو! چونکہ جب مرد مسٹر بن سکتا ہے کیوں قبلہ بنے؟ حافظ شیرازی کے دیوان کی پہلی غزل بہت مشہور ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرع عربی زبان میں ہے:

الا یا ایہاالساقی ادر کاساً و ناولہا

کہ عشق آسان نمود اول، ولے افتاد مشکلہا

یعنی: "ہاں اے ساقی! شراب کے پیالے کا دور چلا اور اُسے میرے حوالہ کر! عشق پہلے پہل آسان معلوم ہوتا تھا، لیکن بعد میں شدید مشکلات پیش آگئیں!"(19) اکبر نے اس غزل کی پیروڈی لکھی ہے:

الا یا ایہا الساقی بد ہووٹی بہ محفلہ

کہ سیٹ آسان نمود اول، ولے افتاد مشکلہا(20)

اس شعر میں "ووٹ" اور "سیٹ" انگریزی الفاظ ہیں۔ اکبر کا یہ عمل برصغیر میں لکھی گئی فارسی شاعری میں بے نظیر نہیں، کم نظیر ضرور ہے۔ یعنی اشعار کی معنویت کو بدل دینے کے لیے، فارسی شاعری میں انگریزی کے خاص الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک اور شعر کی پیروڈی ملاحظہ ہو:

بہ بوئے شہرتیکہ آخر گزٹ زان طرہ بکشاید

حریفا نمضطر بگردند و شور افتد بہ محفلہا(21)

"گزٹ (Gazette)" کا لفظ اکبر نے سرسید ہی سے وابستہ جانتے ہیں اور ان کی اردو شاعری میں بھی مختلف مقامات پر انھوں نے اس کی خاص معنویت کے ساتھ استعمال کیا ہے:

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے

شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا(22)

حال اکبر نے اسی فارسی غزل میں انگریزی الفاظ کو کئی مقامات پر استعمال کیا ہے۔ اس غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں اکبر کی شاعرانہ صلاحیت و مہارت کی داد دینا ہی ضروری ہے:

برآر از دل یکے دست دعا در حضرت باری

کہ تا بخشد دل ترا امتیاز حق و باطلہا(23)

یعنی: اللہ تعالی کی بارگاہ میں دعا کے لیے اپنا ہاتھ پھیلاؤ کہ تجھے حق و باطل میں امتیاز کرنے کی نعمت سے نوازا جائے۔ مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ اکبر اپنی فارسی شاعری میں کبھی کبھی اردو (ہندی) کے الفاظ کا بھی استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔

بگو بہ سیٹھ کہ اورا بھرم نخواہد ماند
بگو بہ برہمن کہ او ادھرم نخواہد ماند
من ار چہ در نظر یار شرمسار شدم
رقیب نیز چنین محترم نخواہد ماند(24)

''سیٹھ''،''بھرم'' اور''دھرم'' کے الفاظ اس رباعی میں غور طلب ہیں۔ خاص طور پر دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں،''رقیب نیز چنین محترم نخواہد ماند'' میں وہ غیر مسلم لوگوں سے گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر چہ محبوب کی نظر میں میرا اعتبار کم ہوگیا ہے، تو اس رقیب سے کہو کہ اس کا اعتبار بھی یقیناً کم ہو جائے گا اور ان کا دھرم اور بھرم سب ختم ہوجائیں گے۔ اسی طرح کی ایک اور طنزیہ رباعی ملاحظہ کیجیے جس کا وزن اور بحر حافظ شیرازی کی ایک غزل کی پیروی میں ہے:

بلبلی برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت
وا ندران برگ ونوا خوش نالہ ہائے زار داشت

یعنی:''ایک بلبل کی چونچ میں ایک خوش رنگ پھول کی پتی تھی اور اس ساز وسامان کے باوجود وہ خوب نالہ وفغاں کر رہی تھی۔''

(25)اب اکبر الہ آبادی کی رباعی ملاحظہ فرمائیں:

سک زر بابوئے در دھوتی زرتار داشت
باوجودش نالہ ہائے زار در اخبار داشت
گفت مش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست؟
گفت ماراخوف فیس ونکس دراین کارداشت(26)

اس رباعی میں تیسرا مصرع حافظ کی مذکورہ بالا غزل کا عیناً درج ہوا ہے۔ مزید یہ کہ''بابو'' اور''دھوتی'' ہندی کے الفاظ ہیں اور''فیس'' اور''ٹکس'' انگریزی کے الفاظ ہیں، جن کو اکبر نے اپنی اس رباعی میں استعمال کیا ہے۔ ایک بابو کی سونے کے دھاگے سے بنی ہوئی لنگی میں کچھ سکے تھے، لیکن اس کے باوجود اخبار میں وہ اپنی غربت کا رونا روتا تھا۔ میں نے اس سے کہا: بالکل وصل کی حالت میں اس قدر نالہ وفغان کا کیا معنی؟ اس نے جواب دیا فیس وٹکس کے خوف نے ہمیں اس کام میں لگادیا۔ اس طرح اکبر نے سماجی حقیقت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ اب ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اگر اس رباعی کو ایک فارسی زبان شخص پڑھے گا یقیناً ان غیر فارسی الفاظ کے مفاہیم کو سمجھنے میں اسے دقت ہوگی۔

آخر میں اکبر کا ایک مزاحیہ شعر بھی توجہ طلب ہے:

پشہ بیدارست و پنکھاکش بہ خواب افتادہ است
اکبر بیچارہ امشب در عذاب افتادہ است(27)

یعنی مچھر جاگ رہا ہے اور پنکھا چلانے والا سو رہا ہے اور اس طرح بیچارہ اکبر آج رات کو عذاب میں پڑا ہوا ہے۔

منابع و مآخذ:

خواجہ محمد زکریا، اکبر الہ آبادی، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2003، ص 16-17

1- اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر الہ آبادی (معروف بہ لسان العصر)، خان بہادر حسین اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب، لاہور، جولائی 2010، ص 54

حافظ شیرازی، دیوان حافظ مترجَم، ترجمہ وتحشیہ ابو نعیم عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، حیدرآباد، کراچی، سنہ ندارد، ص 110

ایضاً ص 110

2- اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر الہ آبادی (معروف بہ لسان العصر)، خان بہادر حسین اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب، لاہور، جولائی 2010، ص 391

حافظ شیرازی، دیوان حافظ مترجم، ترجمہ و تحشیہ ابو نعیم عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، حیدرآباد، کراچی، سنہ ندارد، ص 111

3- اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر الہ آبادی (معروف بہ لسان العصر)، خان بہادر حسین اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب، لاہور، جولائی 2010، ص 274

4- ایضاً، ص 275

5- ایضاً

6- ایضاً، ص 279

7- ایضاً

8- ایضاً

9- حافظ شیرازی، دیوان حافظ مترجم، ترجمہ و تحشیہ ابو نعیم عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، حیدرآباد، کراچی، سنہ ندارد، ص 147

10- اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر الہ آبادی (معروف بہ لسان العصر)، خان بہادر حسین اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب، لاہور، جولائی 2010، ص 537

11- حافظ شیرازی، دیوان حافظ مترجم، ترجمہ و تحشیہ ابو نعیم عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، حیدرآباد، کراچی، سنہ ندارد، ص 148

12- گیان چند جین، لسانی جائزے، بک ٹاک، لاہور، 2018، ص 123

13- ایضاً، ص 124

14- اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر الہ آبادی (معروف بہ لسان العصر)، خان بہادر حسین اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب، لاہور، جولائی 2010، ص 738

15- حافظ شیرازی، دیوان حافظ مترجم، ترجمہ و تحشیہ ابو نعیم عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، حیدرآباد، کراچی، سنہ ندارد، ص 7

16- ایضاً، ص 865

17- ایضاً، ص 867

https:www.darsaal.com/poetry-18/akbar-allahabadi/urdu-poem/html.4533

19- اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر الہ آبادی (معروف بہ لسان العصر)، خان بہادر حسین اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب، لاہور، جولائی 2010، ص 766

20- ایضاً، ص 563

21- حافظ شیرازی، دیوان حافظ مترجم، ترجمہ و تحشیہ ابو نعیم عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، حیدرآباد، کراچی، سنہ ندارد، ص 60

22- ایضاً، ص 559

23- ایضاً، ص 560

☆☆☆

اکبرالہ آبادی کی غزلیہ شاعری

ڈاکٹر شیخ احرار احمد

نائب مدیر: سہ ماہی ''ہندستانی زبان''، ممبئی۔

رابطہ: 7498088534 91+

ظرافت ادب کی جان ہوتی ہے، غالب کے کلام کی آفاقیت کی ایک وجہ اس کی ظرافت بھی ہے۔ اردو کی ظریفانہ شاعری کا باقاعدہ چلن اکبر سے ہوتا ہے لیکن اس کے علاوہ اکبر نے خالص غزلیں بھی کہی ہیں اور اس قدر کہی کہ ان پر مختلف پہلوؤں سے سیر حاصل بات کی جا سکے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ فطری طور پر غزلیہ شاعری میں ان کے خیالات تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ ایسے کئی اشعار ان کے یہاں مل جائیں گے جسے دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس طرح کے کلام ایامِ نوجوانی کے جذباتی آبشار ہیں جو چشمۂ امنگ سے پھوٹ کر تیزی سے رواں دواں ہیں۔ مثال کے لیے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

ایک کافر پر طبیعت آگئی
پارسائی پر بھی آفت آگئی

جوانی کی ہے آمد شرم سے جھک سکتی ہیں آنکھیں
مگر سینے کا فتنہ رک نہیں سکتا ابھرنے سے

عشوہ بھی ہے شوخی بھی تبسم بھی حیا بھی
ظالم میں اور اک بات ہے اس سب کے سوا بھی

معترض کیوں ہو اگر سمجھے تمہیں صیاد دل
ایسے گیسو ہوں تو شبہ دام کا ہو یا نہ ہو

ظرافت اپنی جگہ اور فطری تقاضے اپنی جگہ۔ کسی کافر ادا پر دل کا آنا اور اس کے سراپے کے نشیب و فراز کی کشش میں محو ہونا اور پھر اس کے عشوہ و تبسم کے سوا بھی کوئی ایسی بات ہے اس میں جو عاشق کو اس کی طرف مائل کی ہے جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا۔ وہ بات کیا ہے جو شاعر یا عاشق کے ذہن میں بھی پوری طرح واضح نہیں۔ دراصل وہی بات سب سے اہم ہے جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا اور یہی وہ بات ہے جو تجاہل عارفانہ سے بلند ہو کر ایمائیت کے دائرے میں آکر شعر کی معنی آفرینی دو چند کر دی اور شعر کے حسن میں اضافہ ہو گیا۔

غزل کے شعر میں ظرافت کے اعلیٰ نمونے پہلے پہل غالباً غالب کے یہاں ملتے ہیں لیکن ''ادابندی میں مومن کا کوئی ثانی نہیں'' یہ بات بہت حد تک درست بھی معلوم ہوتی ہے ہاں! متعدد شعرا کے یہاں بھی ادابندی کے ساتھ اعلیٰ ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ اکبر کا یہ شعر اس موضوع پر کسی وضاحت کا محتاج نہیں:

جو کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

اس کے علاوہ اکبر کے یہاں ادابندی کے ساتھ ظریفانہ انداز اظہار کے کئی نمونے ملتے ہیں جس سے صرف اکبر کی قادر الکلامی ہی نہیں بلکہ ان کی برجستگی اور طبیعت کی شگفتگی کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

میری یہ بے چینیاں اور ان کا کہنا ناز سے
ہنس کے تم سے بول تو لیتے ہیں اور ہم کیا کریں

تیار تھے نماز پہ ہم سن کے ذکر حور
جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طول شب فراق کو تو ناپ دیجئے

بت کدہ میں شور ہے اکبر مسلماں ہوگیا
بے وفاؤں سے کوئی کہہ دے کہ ہاں ہاں ہوگیا

پہلے شعر میں عاشق کی بے چینیوں کا خیال رکھتے ہوئے ہنس کر بول لینا یہ بھی محبوب کی نظر عنایت ہے۔ دوسرے شعر میں حوروں کے لیے نمازی بننا اور پھر جلوۂ بتانِ حسن کو دیکھ کر نیت کا بدل جانا معنی خیزی سے پر ہے۔ اس میں بذلہ سنجی کے ساتھ ساتھ نشتریت بھی ہے جسے قاری خوب سمجھتا ہے اور حظ بھی اٹھاتا ہے۔ تیسرا شعر مزاح کا عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے۔ ریاضی کے اصولوں کے ذریعے طولِ شب فراق کو ناپنا صرف ساعتوں پر موقوف نہیں بلکہ اس اضطراری کیفیت کو بھی ناپنا ہے جو اس شب کو طویل محسوس کراتی ہیں۔ لفظ دعویٰ، ریاضی اور ناپ، ان تینوں نے پورے شعر کی معنویت ہی بدل دی ہے جہاں طولِ شب فراق کا احساس پوری شدت سے برقرار ہے لیکن مذکورہ تینوں لفظوں نے اسے مزاح کا رنگ دے دیا ہے۔ چوتھا شعر کوئی خاص معنویت نہیں رکھتا لیکن اس کے مصرع ثانی میں ہاں ہاں کی تکرار جس انداز سے ہوئی ہے اس کی ادائیگی نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔

یہ دلبری یہ ناز یہ انداز یہ جمال
انساں کرے اگر نہ تری چاہ کیا کرے

اس کائنات کی ساری نعمتوں میں سب سے عمدہ عورت ہے جس کے بغیر کائنات کا تصور ہی فضول لگتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا میں بنیادی وجود یہی ہیں، مرد اور عورت، باقی جو کچھ بھی ہے وہ اضافی ہے اور عورت کی وہ فطری خوبیاں جن کا ذکر مندرجہ بالا شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں اکبر نے کیا ہے اس کے بغیر جمالیاتی حس کے سارے سوتے خشک لگتے ہیں۔ عورت وہ محور ہے جس کے گرد انسان کی ساری دنیاوی خواہشیں رقص کناں ہیں۔ لیکن اکبر نے یہاں پر ایک معیار برقرار رکھا ہے، وہ ایسی خواہشوں کو جگہ نہیں دینا چاہتے جسے دل حقیر سمجھتا ہو، اکبر کے نزدیک وہ آرزو معتبر اور اہم ہے جو سینے میں ایک خاص انداز سے رہے، جس میں امنگ اور سوز وگداز تو ہو لیکن رسوائی نہ ہو:

کیا وہ خواہش کہ جسے دل بھی سمجھتا ہو حقیر
آرزو وہ ہے جو سینے میں رہے ناز کے ساتھ

عمر کی ارتقائی منزلوں اور تجربوں کے ساتھ انسان کی فکری جہتیں بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ نوجوانی کی رومان پرور خیالی فضاؤں سے انسان جب حقیقت کی زمین پر قدم رکھتا ہے تو بہت سی خواہشیں سمندر کی منہ زور لہروں کی طرح ساحل تک پہنچ کر دم توڑ چکی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو امیدوں کی کرچیاں اس قدر دلِ مایوس میں پیوست ہوتی ہیں کہ

نئی شورشیں سر اٹھانا بھول جاتی ہیں۔ اکبر بھی اس عالم کیف سے گزرے ہیں جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

دلِ مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں
امیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں
مری بے تابیاں بھی جزو ہیں اک میری ہستی کی
یہ ظاہر ہے کہ موجیں خارج از دریا نہیں ہوتیں

پہلے شعر میں، دلِ مایوس میں شورشوں کا برپا نہ ہونا اور امیدوں کا اس قدر ٹوٹنا کہ اب پیدا نہ ہونا کا معنوی تاثر اپنی جگہ لیکن اس شعر کا حسن اس کے متکلم غائب میں زیادہ محسوس کیا جا سکتا ہے جس نے ترسیلِ مفہوم کی کیفیت ہی بدل دی ہے۔ جب کہ دوسرے شعر میں متکلم حاضر سے شعر کے حسن میں اضافہ محسوس ہوتا ہے۔ بیتابیوں کو ہستی کا جزو قرار دے کر اس بات کی طرف بھی اشارہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ انسان کو قدرت نے سیمابی فطرت عطا کی ہے۔ یہ بھی اپنے خالق کی طرح اپنی ایجادات یا تخلیق سے مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا جب کہ دوسرے مصرعے میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ جتنا اسے قدرت عطا ہوئی ہے اس سے تجاوز بھی نہیں کر سکتا۔ یعنی کہ موجیں چاہے جتنی بھی سرکش ہوں لیکن دریا سے باہر نہیں ہو پاتیں۔

اکبر کے کلام سے ان کی فکری جہات کا علم بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی اوروں کی طرح عقل پر جنون اور عشق کو فوقیت دیتے ہیں، ان کے نزدیک جذبے کی اہمیت ہے کیوں کہ جذبہ ہی وہ قوت ہے جو انسان کو فعال رکھتا ہے، مثال دیکھیں:

چشمِ خرد سے عار تھی حسنِ جنوں پسند کو
عقل نے آنکھ بند کی اس نے حجاب اٹھا دیا

چشمِ خرد جب تک کھلی رہے گی تب تک شدتِ جذبات نقطۂ عروج یعنی جنون کو نہیں پہنچ سکتا اور جنون جب تک حجاب نہیں اٹھائے گا تب تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اکبر کے یہاں عشقیہ اور صوفیانہ طرزِ اظہار کے علاوہ لفظ اور معنی کے تعلق سے بھی ایک نظریہ قائم ہے۔ وہ لفظ پر معنی کو فوقیت دیتے ہیں۔ ہمارے علمائے ادب کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی کے نزدیک لفظ قالب ہے اور معنی اس کی روح، قالب کے بغیر روح کا قیام ممکن نہیں، کچھ کے نزدیک لفظ کا کام معنی تک رسائی کرانے کا ہے پھر اس کے بعد لفظ کے وجود کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ اکبر بھی موخرالذکر نظریے کے حامی نظر آتے ہیں، مثال دیکھیں:

حال دل میں سنا نہیں سکتا
لفظ معنی کو پا نہیں سکتا
جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اس بحث سے قطع کلام کرتے ہوئے اکبر کی غزلیہ شاعری کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ ان کی جولانی طبیعت اگر سنجیدگی سے عشقیہ شاعری اور خاص کر غزل کی طرف رجوع ہوئی ہوتی تو بھی وہ اپنی الگ راہ نکال سکتے تھے۔ پھر بھی ان کے یہاں غزلیہ شاعری کا اتنا سرمایہ ہے کہ اس پر تحقیق و تنقید کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی جا سکے۔

☆☆☆

بزم ظرافت کا بادشاہ: اکبرالہ آبادی

ڈاکٹر آفتاب عالم اعظمی

ڈاکٹر آفتاب صاحب ایم ایم کے، ڈگری کالج، منگراواں، اعظم گڑھ یوپی کے شعبۂ اردو میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کئی قومی اور بین الاقوامی سمینار میں شرکت کر چکے ہیں۔ متعدد تحقیقی مضامین ملک کے موقر رسالوں کی زینت بن چکے ہیں۔ آپ نے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ اور بنارس ہندو یونی ورسٹی، بنارس سے حاصل کی ہے۔

Email : aaftabjfa@gmail.com / mob : +91 9452411642

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد ہندوستانی تاریخ پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مغل سلطنت جو پہلے ہی سے برائے نام رہ گئی تھی۔ اس ناکامی کے بعد مکمل طور پر ختم ہو گئی اور پورے ملک پر انگریز حکمراں قابض ہو گئے۔ یکا یک حکومت چھن جانے سے مسلم قوم احساس کمتری کا شکار ہو گئی اور ترقی کے سارے مواقع مسدود ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی وہ تہذیب جو تقریباً آٹھ سو سال سے قائم تھی رفتہ رفتہ دم توڑنے لگی۔ اس کے برعکس ایک نئی تہذیب وجود میں آ گئی جو اپنی جڑیں تیزی سے جمانے لگی تھی۔ انگریزوں کی لائی ہوئی یہ نئی تہذیب بظاہر نئی روشنی لے کر آئی تھی جس سے مسلم مفکرین کشمکش میں مبتلا ہو گئے اور وہ یہ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ ہم کس طرف جائیں۔ ان مفکرین میں ایک قدیم یعنی مشرقی تہذیب کا دلدادہ تھا جو نئی تہذیب (نئی روشنی) کو اختیار کرنے میں کسی صورت تیار نہ تھا لیکن ایک ایسا بھی طبقہ تھا جو اس نئی روشنی پر چلنے کے لیے انگریزوں سے مفاہمت کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس نئی روشنی کی حمایت میں سرسید پیش پیش تھے۔ غدر کا سانحہ جس وقت پیش آیا سرسید چالیس سال کے ایک تجربہ کار انسان تھے۔ انھوں نے جدید و اعلیٰ تعلیم مغرب سے حاصل کی اور وہاں کی تہذیب و تمدن کو قریب سے دیکھا تھا لیکن وہ ہندوستانی حالات سے غافل بھی نہ تھے بلکہ دونوں کا مشاہدہ و تجزیہ کیا اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے انگریزوں سے مفاہمت کی بات کہی۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کی اس نئی روشنی سے مسلمان اعلیٰ عہدے پر فائز ہو سکتے ہیں اور موجودہ حکمراں سے مسلمانوں کی جو کشمکش ہے وہ بھی دور ہو سکتی ہے۔ اکبرالہ آبادی محض گیارہ سال کے بچے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت مشرقی ماحول میں ہوئی تھی اور محنت سے ترقی کر کے منصف اور سب جج کے اعلیٰ عہدے تک پہنچے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس نئی روشنی (نئی تہذیب) سے مسلم قوم اپنی تہذیب کھو دے گی اور عیسائی مذہب اختیار کر لے گی۔ اکبر خود اس حکومت میں سرکاری ملازم اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اس لیے حکمراں طبقہ کی کھل کر مخالفت سے گریز کیا اور شاعری میں طنز و ظرافت کا پیرایہ اختیار کیا۔ سرسید نئی تعلیم اور نئی تہذیب کے زبر

دست حامی تھے جب کہ اکبرالہ آبادی مشرقی تہذیب کے حامی اور اس نئی روشنی سے سخت بیزار اور قوم کی کورانہ تقلید کے انتہائی مخالف ہیں۔اس پر اکبر نے اس انداز میں طنز کیا ہے:

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے
اسے کشتی نہیں ملتی، اسے ساحل نہیں ملتا
نئی تہذیب میں دقت تو زیادہ نہیں ہوتی
مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

اکبر نہ صرف انگریزی تعلیم اور اس کی تہذیب کے مخالف تھے بلکہ انھوں نے مسلم قوم کی اخلاقی زبوں حالی کی بھی نشاندہی کی اور ان کو اخلاقی ومعاشرتی تعلیم کا پیغام طنز وظرافت کے اسلوب میں دیا۔اکبر کی شخصیت اور شاعری کو زیادہ واضح انداز میں سمجھنے اور غور کرنے کے لیے اہم نقادوں کی رائے پیش کر دینا مناسب ہوگا جس سے ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کے مبہم راز ظاہر ہوسکیں گے جن سے ان کی طنزیہ وظریفانہ شاعری کی تفہیم بھی ہو سکے گی۔اکبر کی شخصیت اور ظریفانہ شاعری پر اردو کے معروف نقادوں نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے، سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

"اکبر کی تخلیقات کو بخوبی سمجھنے کے لیے مذہب اسلام، مسلم ثقافت، ہندوستان کی تاریخ اور بیسویں صدی کی سیاسی اور سماجی واقعات کا جاننا اشد ضروری ہے کیوں کہ ہنسی ہنسی میں وہ ایسی باتوں کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں جنھیں جانے بغیر ان کے طنز سے لطف نہیں لیا جاسکتا۔وہ انگریزی، فارسی، عربی، اور ہندی لفظوں کا استعمال بڑی آزادی سے کرتے تھے اور اپنے دل کی بات کسی نہ کسی مذاقیہ رنگ میں ظاہر کر دیتے تھے۔"(۱)

عبدالماجد دریاآبادی لکھتے ہیں:

"اکبر کی شہرت ومقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی ظرافت تھی۔ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا۔ان کی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ہندوستان میں آج جو گھر گھر ان کا نام پھیلا ہوا ہے۔اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری ولطیفہ گوئی کی ڈالی ہوئی ہے۔قوم نے ان کو جانا مگر اسی حیثیت سے کہ وہ روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں، ملک نے ان کو پہچانا مگر اسی حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں"۔(۲)

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"اکبر مشرقیت کے دلدادہ اور مولویت سے بیزار ہیں۔وہ باطن کو ظاہر پر فوقیت دیتے ہیں۔وہ مغرب کی مادیت کو مذہب اور اخلاق کا دشمن سمجھتے ہیں۔وہ ہندوستان کے قومی تحریکوں کے حامی تھے لیکن ہڑبونگ سے قطعاً بیزار تھے۔وہ شوہر پرست بیوی کو پبلک پسند لیڈی پر ترجیح دیتے ہیں۔غرض وہ ان تمام باتوں کے خلاف جنگ آزما تھے جن کا تعلق بد مذاقی، کورانہ تقلید، بے تمیزی، اور تنگ نظری تھا"۔(۳)

اردو شاعری میں طنز ومزاح کی روایت امیر خسرو سے شروع ہوئی۔امیر خسرو اور دکنی شعرا کے بعد شمالی ہند میں جعفر زٹلی، فائز دہلوی نے شعری اسلوب میں نئے نئے حربے اور طریقے استعمال کیے جو میر ومرزا کے دور میں ہجو اور شہر آشوب میں تبدیل ہوگئے۔میر ضاحک وسودا، انشاء ومصحفی اور آبرو ومرزا مظہر کے ادبی معرکے اور آپسی چپقلش نے

اس شعری اسلوب کو ترقی دی اور بعد میں انشانے خالص مزاح کو برتنے میں پہل کی لیکن اس عہد تک یہ ادبی رجحان باقاعدہ ایک اسلوب کا درجہ حاصل نہ کر سکا بلکہ انفرادی وشاعرانہ مزاج کی روش عام رہی ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد تاریخ وتہذیب نے ایسا چولا بدلا کہ ثقافت وتمدن کے نئے نئے انداز واطوار وضع ہوئے اور حالات کا شعور وادراک رکھنے والے ادبا وشعرا نے طنز وظرافت کے اسلوب میں گفتگو کا جو نیا طریقہ ڈھونڈ نکالا ان میں پہلا شخص حیوان ظریف یعنی مرزا غالب تھے جو خود پر بھی ہنسے اور دوسروں کو بھی ہنسایا اور طنز وظرافت کے پیرایہ میں اپنی بات کہہ گئے۔ ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے جب "اودھ پنچ" جاری ہوا تو طنز وظرافت کا ایک نیا اور نکھرا ہوا روپ سامنے آیا۔ شاعری میں نادر استعارات وتشبیہات، تلمیحات وکنایات اور محاورات وضع ہوئے۔ ان سے شاعری میں نئے نئے معانی اور القاب رائج ہوئے جس کے سرخیل اور بادشاہ صرف اکبر الہ آبادی ہیں جو شاعری میں اس طرز اسلوب کے موجد اور خاتم بھی ہیں۔

اکبر الہ آبادی کے کلام چار جلدوں پر مشتمل ہیں لیکن یہ عام خیال ہے کہ ان کی ظریفانہ شاعری کا ایک بڑا حصہ منظر عام پر آنے سے رہ گیا ہے جس کو وہ نجی محفلوں تک محفوظ رکھتے اور خاص خاص دوستوں کو ہی سناتے اور اسے عام کرنے سے گریز کرتے۔ اکبر کی شاعری کی آبروان کی ظرافت ہے اور اس میں طنز کا عنصر داخل کر کے حکمراں طبقہ کو نہ صرف نشانہ بنایا بلکہ مشرقی ومغربی تعلیم اور اس کی تہذیب کی موافقت ومخالفت کرنے والے کو بھی نہیں بخشا اور اپنے خاص طرز اسلوب سے ان لوگوں کو وہ پیغام دے دیا جو دوسروں کو غور وفکر کے بعد بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اکبر کی شاعری کو نقادوں نے تین اور پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے لیکن خود اکبر نے اپنی شاعری خصوصاً غزل کو تین دور میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن ان کے کلام کے جائزے کے بعد بآسانی چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا دور ۱۸۶۶ء تک ہے۔ اس میں بچپن وجوانی کے عشقیہ جذبات، شوخی وروانی، رندی وسرمستی، اشعار کی برجستگی، لطف زبان اور حسن بیان کے جوہر عام غزل گو کی طرح نمایاں ہے اور رنگ تغزل نکھرا ہوا ہے لیکن اخلاقی ومعاشرتی جذبات کا عکس بظاہر نظر آنے لگا تھا جس کا اندازہ اکبر کے ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

محبت ان سے کر کے پھنس گئے ہیں ہم تو آفت میں
نہ دل قابو میں آتا ہے نہ اُن پر زور چلتا ہے

عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہے
پر کروں کیا؟ اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے

دوسرا دور ۱۸۸۴ء تک ہے۔ اس میں اخلاقی ومعاشرتی مضامین کی آمد ہے۔ طرز ادا میں سنجیدگی اور لکھنوی رنگ کی رعایت لفظی کی کار فرمائی ہے۔ انداز بیان حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ ظرافت کا چٹخارہ پن بھی کلام میں داخل ہو جاتا ہے جو آگے چل کر اکبر کی شخصیت اور شاعری دونوں کو بلند مقام عطا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اکبر کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اللہ بچائے مرض عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

کیا پوچھتے ہو مجھ سے پہلو میں تیری کیا ہے
اب تو نہیں ہے کچھ بھی دل تھا سو کھو گیا ہے

تیسرا دور ۱۹۰۸ء تک ہے۔ یہ دور اکبر کی شاعری کا اہم دور ہے جس کی بدولت اکبر کی شہرت لازوال ہوئی۔ اس دور میں ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر بھی داخل ہو گیا۔ اخلاقی ومعاشرتی مضامین کا استعمال کثرت سے ہونے لگا اور مضمون آفرینی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ دراصل یہ دور اکبر کے نصب العین اور اسلوب دونوں

کے لحاظ سے اہم ہے جو اکبر کی شاعری کی معراج اور کل کائنات ہے جس کی وجہ سے اکبرا کبر ہوئے اور ظرافت ان کی شاعری کی آبرو ثابت ہوئی اور ہندوستانی معاشرے کو اخلاق کا پیغام دیا۔اس طرز میں اکبر کے اشعار ملاحظہ کریں:

سرد تھا موسم ہوائیں چل رہی تھیں برفبار
شاہد معنیٰ نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف
شعر اکبر میں کوئی کشف وکرامات نہیں
دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

چوتھا دور ۱۹۰۹ء تا وفات ۱۹۲۱ء تک کا ہے۔اکبر کی دوسری بیوی جوان کو بہت محبوب تھی ۱۹۱۰ء میں فوت ہوگئی اور اس کے دو تین سال بعد چھوٹا بیٹا سید ہاشم جو ابھی ۱۴ سال کا تھا داغ مفارقت دے گیا۔ان واقعات نے اکبر کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا اور خود اکبر ۶۲ سال کے ہو چکے تھے ان سے اب شاعری میں کسی طرح کی جدت کی امید نہ تھی البتہ معاملات عشق، اخلاقی و معاشرتی فلسفہ، سیاست، اور تصوف و معرفت کے مضامین میں جدت پیدا کی اور ردیف و قافیہ میں اپنے خیالات کی بہاریں دکھانے لگے اس کے اثر سے طنز و ظرافت کے اسلوب میں کمی آنے لگی۔اکبر کے اشعار ملاحظہ کریں:

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا
نگاہ اٹھی ہے احساس ما سواء کے لیے
کہاں ہے دل ذرا روکے اسے خدا کے لیے

اکبر کی شخصیت اور ادوار شاعری کے بعد ان کی ظریفانہ شاعری اور اس کے موضوعات، (مذہب، سیاست، نئی تہذیب، نسوانی آزادی، تعلیم) کا ذکر بھی انتہائی ضروری ہے جس پر اکبر کی کل شاعری محیط ہے۔اس زمانے میں یہ موضوعات بڑے اہم تھے۔انگریز حکمراں زندگی کے تمام شعبہ جات میں اپنا دبدبہ قائم کر چکے تھے اور اکبر انگریز حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اپنی شاعری میں طنز و ظرافت کو مصلحتاً اپنایا لیکن حسب موقع کھل کر مخالفت بھی کی۔اکبر اور مرزا غالبؔ کے تعلق سے یہ خیال عام ہے کہ اکبر بزدل اور مصلحت پسند شاعر تھے اور انھوں نے مجبوری میں طنز و ظرافت کا نقاب اوڑھ لیا تھا اور مرزا غالب نے اردو میں خطوط نویسی اس لیے شروع کی کہ وہ ضعیف اور ناتواں تھے اور فارسی کے مروج خطوط نویسی نہیں کر سکتے تھے جب کہ ایسا نہیں ہے۔دراصل یہ دور تبدیلیوں کا دور تھا جس سے ادب میں بھی تبدیلی رونما ہوئی اور اکبر نے بھی لعن طعن سے بچنے کے لیے طنز و ظرافت کا لحاف اوڑھ کر مذہب، سیاست، نئی تہذیب، نسوانی آزادی، اور تعلیم کے موضوعات پر شاعری کی اور اشارہ و کنایہ کے انداز میں نئی تہذیب کے سیلاب کو روکنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر دیا لیکن یہ سیلاب رک نہ سکا اور اکبر کی لازوال ظریفانہ شاعری وجود میں آگئی جس کے وہ خود موجد اور خاتم ہیں۔ان موضوعات کی مناسبت سے اکبر کے اشعار ملاحظہ کریں:

مذاہب پر اشعار:

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اڑ جائے
مطلب کی کہوں تو پالیسی میں اڑ جائے
مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا
انسان اڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے

سیاست پر اشعار:

تم ملو نہ ملو مجھ سے منو یا نہ منو
ساتھ رہنا ہے اس ملک میں اے ہم وطنو

اہل مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد
آسماں تنگ ہو تم پر مگر اتنا نہ تنو

نئی تہذیب پر اشعار:

ہم کو نئی روشنی کے حلقے جکڑ رہے ہیں
باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہیں کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے

نسوانی آزادی پر اشعار:

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھے
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی
نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید
بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے

تعلیم پر اشعار:

علم اگر ہوتا زیادہ اور ہوتی حرص کم
صلح رہتی بیشتر لوگوں میں کم ہوتی نزاع
مغربی رنگ وروش پر کیوں نہ اترائیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

خان بہادر اور لسان العصر اکبر الہ آبادی نے حسب روایت غزل سے اپنی شاعری کی ابتدا کی لیکن قومی زبوں حالی اور اپنی بے بسی کی فکر میں جلد ہی انھوں نے اخلاقی اور پیامی شاعری شروع کر دی اور ان رجحانات کو ہدف طنز بنایا جو مشرقی روایات اور اسلامی شعار کے بالکل منافی تھے اس کے لیے انھوں نے اپنی شاعری میں طنزیہ وظریفانہ اسلوب اختیار کیا۔ شاعری میں وہ نہ صرف قوانی کے بادشاہ تھے بلکہ موقع محل کے لحاظ سے لفظوں کے استعمال کے بھی بادشاہ تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں انگریزی الفاظ کمسٹریٹ، گزٹ، ڈارون، ڈنر، اسپیچ، کونسل، کیمپ، پریڈ اور کمیشن کو نہ صرف خوبصورتی سے استعمال کیا بلکہ بت، صنم، مس، شیخ، سید، سید صاحب، اونٹ، گائے، کلیسا، حرم، دیر، بتکدہ، کالج، برہمن، لالہ، صاحب، مرزا، بابو، مولوی، خرعیسیٰ، اور جان بُل کی نئی نئی اصطلاحیں وضع کیں اور کلو، صلو، پیرو، حسو، بدھو، گنگو، گھورن، جمن، بقاتی، شبراتی، کریمن، اور نصیبن جیسے پشت ومتبذل الفاظ کا استعمال کر کے روز مرہ کے مسائل کو موضوع بنایا۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مصلح اور ریفارمر کی حیثیت سے بھی سامنے آئے۔ ان کے کلام میں زندگی کا فلسفہ اور نئے انقلاب کی گونج بھی ہے۔ مذہب، سیاست، نئی تہذیب، نسوانی آزادی، اور تعلیم ان کی شاعری کے خاص موضوعات تھے۔ وہ مشرقی کلچر اور روایات کا تحفظ ہر حال میں چاہتے تھے۔ کلام کی دلکشی اور دل آویزی ان کے تخیل کا حصہ تھا۔ نادر تشبیہات واستعارات ان کے نسخہ ظرافت کا جز واعظم تھا۔ انگریزی، ہندی، عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال اپنی شاعری میں بڑی آزادی سے کرتے تھے۔ اشارہ وکنایہ میں بات کرنے کا ہنر بخوبی جانتے تھے۔ اس حیثیت سے وہ پیامی شاعر ہی نہیں بلکہ بزم ظرافت کے بادشاہ بھی تھے۔

حوالہ جات:

۱۔ ص۔ ۲۳۴، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ رسید احتشام حسین راین سی پی یو ایل، نئی دہلی ۲۰۰۱ء

۲۔ ص ۱۹، ۲۱، انشائے ماجد یا لطائف ادب رعبد الماجد دریا آبادی رادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ ۱۹۹۱ء

۳۔ ص ۲۸۹، ۲۹۰، میزان نثر جلد ۲ ررشید احمد صدیقی رمکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۹۹ء

☆☆☆

اکبرالہ آبادی کا تصور نسواں، موڈرن عورت اور فکر تہذیب ومعاشرہ

ڈاکٹر صالحہ صدیقی (الہ آباد)

ڈاکٹر صالحہ صدیقی کا تعلق الہ آباد سے ہے۔ آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے اردو میں پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ کئی کتابوں کی مصنف، مترجم اور مرتب ہیں۔ ملک کے کئی موقر رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ کئی سمینار، کانفرنس اور ورکشاپ میں شرکت کر چکی ہیں۔

Email : salehasiddiquin@gmail.com / Mob: 9899972265

اکبرالہٰ آبادی ایک ایسے شاعر تھے جنھیں اپنی تہذیب وثقافت اپنی روایات سے بے پناہ محبت تھی۔ جس پر وہ کسی طرح کی آنچ نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ ان کے افکار ونظریات پر گفتگو کرنے سے قبل ان کی سوانح پر طائرانہ نظر ڈالیں تو جیسا کہ نام سے ہی واضح ہو جاتا ہے اکبرالہٰ آبادی (سنگم نگری، پریاگ) کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام سید اکبر حسین رضوی تھا اور تخلص اکبر تھا۔ آپ 16 نومبر 1846ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرکاری مدارس میں پائی، آگے چل کر محکمہ تعمیرات میں ملازم ہو گئے۔ 1869ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1870ء میں ہائی کورٹ کی مسل خوانی کی جگہ ملی۔ 1872ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ 1880ء تک وکالت کرتے رہے پھر منصف مقرر ہوئے۔ 1894ء میں عدالت خفیہ کے جج مقرر ہو گئے۔ 1898ء میں کا ان بہادر کا خطاب ملا۔ اس کے علاوہ مخزن لاہور نے انھیں ''لسان العصر'' کا خطاب دیا تھا۔ 1903ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اکبرالہٰ آبادی نے جنگ آزادی ہند 1857ء میں پہلی جنگ عظیم اور گاندھی جی کی امن تحریک کا ابتدائی حصہ دیکھا تھا۔ اردو ادب میں اکبرالہ آبادی کو جو شہرت ان کی منفرد انداز کی شاعری کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ انھوں نے ابتدا میں حیدر علی آتش سے اصلاح لی۔ آگے چل کر انھوں نے اپنا منفرد لب ولہجہ پیدا کیا اور اپنی راہ خود نکالی۔ ان کی شہرت کی اہم وجہ ان کی ظرافت آمیز اور طنزیہ اشعار پر مبنی ہے۔ ان کے کلام میں سید، مس، اونٹ، کالج، گانے، کلیسا، برہمن، جمن، بدھومیاں، جیسے مخصوص اصطلاحیں اور علامتیں ہیں۔ ان کے مطبوعہ کلام میں تین کلیات شامل ہیں۔ جن میں دو ان کی زندگی میں شائع ہو گئے تھے جب کہ تیسرا ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

اکبرالہٰ آبادی ہمارے پیامی شاعروں میں سے ایک تھے اور ان کا پیام ہے اپنے ماضی سے رشتہ استوار کرنا۔ 1857ء کی ناکام بغاوت کے بعد ہندستان کی تاریخ پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ لہٰذا مسلم عورتوں کی اصلاح، فلاح وبہبود کے لیے سرسید اور ان کے رفقا نے نمایاں کردار ادا کیا، معاشرے میں عورتوں کو ان کا صحیح مقام دلانے کی حمایت میں سرسیّد نے تعدادِ ازواج، پردے کی بے جا رسم اور

بہ آسانی طلاق دیے جانے کی مخالفت کی۔ تعلیم نسواں کے بھی وہ بہت بڑے ہم نوا تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۰ء سے ''تہذیب الاخلاق'' میں عورتوں کی تعلیم، رفاہ عورات اور کثرت ازواج وغیرہ کے عنوانات سے مختلف مضامین تحریر کیے۔

سرسیّد کے رفقا میں خاص طور پر نذیر احمد نے مسلم عورتوں کی اصلاح کے لیے متعدد ناول لکھے جن میں ''مراۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ الطاف حسین حالی نے بھی عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کے بعد عورتوں کی تعلیم کو لے کر سنجیدگی سے کسی نے اس موضوع پر توجہ کی تو وہ حالی ہیں۔ خواتین پر لکھی گئی کتابوں میں ''مناجات بیوہ''، ''چپ کی داد'' اور ''مجالس النساء'' کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے یہ کتابیں لکھ کر سماج و معاشرے کی توجہ عورتوں کی بے بسی و لاچاری کی طرف منعقد کیں۔ انھوں نے نثر ہو یا نظم ہر طریقے سے قوم کو تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ لڑکیوں کی تعلیم کی جانب عملی اقدام کے ساتھ ساتھ حالی نے خواتین کے مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور عورتوں کی زبوں حالی پر قصے کے انداز میں ''مجالس النساء'' لکھی، یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اردو تنقید اور سوانح کی طرح ہندستان کی حقیقی عورت سے ہماری ملاقات بھی حالی کی تخلیقات میں ہوتی ہے۔

اکبرالہ آبادی کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت ہمارے ذہن میں ایک ایسے شخص کا تصور ابھرتا ہے جو انگریزی تہذیب کا شدید مخالف ہے۔ اکبر کو نہ صرف انگریزی تہذیب بلکہ انگریزی زبان، انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت سے شدید نفرت تھی۔ شاید اس کی اہم وجہ یہ بھی تھی کہ انھیں اپنی تہذیب و تمدن سے شدید انسیت تھی۔ وہ اپنی تہذیب پر کسی بھی طرح آنچ نہیں آنے دینا چاہ رہے تھے۔ ان کا پیغام بھی یہی تھا کہ جدید تہذیب کے طوفان سے بچو اور اپنی پرانی تہذیب سے رشتہ استوار کرو۔

اکبر نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں روایتی انداز کی غزلیں بھی کہی مگر انھیں جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ اصلاحی شاعری کے لیے بنے ہیں اور اصلاحی شاعری کے لیے انھوں نے اقبال کی طرح نظم کا سہارا لیا اور اردو نظم کو نئی وسعت عطا کی۔ لیکن اکثر محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ انھوں نے سرسید کی مخالفت میں ہر طرح کی آزادی اور ترقی کی مخالفت کی۔ محمد حسن اس کی نفسیاتی توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''ان کے اندر بھی ویسی ہی مقبولیت، ویسے ہی اعزاز وعظمت کی تمنا کروٹیں لیتی رہی جو ان کے ہم عصر سرسید کو حاصل تھی۔ لیکن قوم وملت نے سرسید کی جیسی قدر شناسی کی، مسلم پبلک کے ایک بڑے تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ حلقے میں ان کی جیسی آؤ بھگت ہوئی، اکبرالہٰ آبادی اس سے محروم رہے۔ سرکار برطانیہ نے بھی جس کے وہ نمک خوار تھے جہاں سرسید کو ''سر'' کے خطاب سے نوازا، انھیں صرف ''خان بہادری'' کے لائق سمجھا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید کے لیے رشک وعناد کے جذبات اکبرالہ آبادی کے اندر پرورش پانے لگے۔ چنانچہ سرسید کی شاید واحد ذات ہے جسے انھوں نے بحیثیت ایک فرد کے اپنی طنزیہ شاعری کا نشانہ بنایا ہے۔ سرسید کو ملعون و مطعون بنانے میں انھوں نے کوئی کسر چھوڑ نہ رکھی۔''

(بحوالہ: طنزیہ ادب کی نفسیات اور اکبرالہ آبادی کی طنزیہ شاعری۔ سید محمد حسن، ص۔ ۷۔۶)

فرد و سماج کی صحیح تربیت اور فلاح و بہبود کا بہترین وسیلہ حصول تعلیم ہے۔ اس کے بنا انسان کی زندگی کا کوئی مقصد، کوئی وجود، باقی نہیں رہتا۔ اس کی زندگی منظم نہیں ہوتی بلکہ بکھری ہوئی ہوتی ہے۔ تعلیم صرف کتابوں کے مطالعہ کرنے کا نام نہیں، بلکہ تعلیم ایک ایسی شے ہے جو انسان اور جانوروں کی زندگی کی تفریق کرتی ہے، انہیں جینے کا سلیقہ

سکھاتی ہے، انہیں سماجی، اخلاقی، اور ذہنی طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے۔ تعلیم ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنی صلاحیتوں کی پہچان کرتا ہے۔اور اگر کسی انسان کے پاس علم کی دولت نہ ہو تو اس کی زندگی بے لگام ہو جاتی ہے جس کو نہ تو راستے کی خبر ہوتی ہے اور نہ ہی منزل کا پتہ ہوتا ہے۔اس لئے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ تعلیم حاصل کی جائے۔اور اس میں مرد و عورت دونوں شامل ہوں۔ تعلیم حاصل کرنے کا حق مرد و عورت دونوں پر لازم ہے۔کیونکہ گھر ہو یا سماج، معاشرہ ہو یا تہذیب کی نشو نما ان سب میں مرد اور عورت دونوں برابر کے شریک اور حصے دار ہوتے ہیں۔ایک کے بنا دوسرے کا نہ تو کوئی تصور ہے، اور نہ ہی ان دونوں میں کسی ایک کے بنا اس سماج کا نظام چل سکتا ہے۔۱۸۹۹ء میں کلکتہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا اس میں جسٹس سید امیر علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

> ''میری رائے میں لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کے متوازی چلنا چاہئے تا کہ سوسائٹی پر اس کا سود مند اثر پڑے۔جب تک ترقی کے دونوں جزو برابر تناسب سے نہ ہوں گے کوئی عمدہ نتیجہ نہیں ہو سکتا۔'' (مسلم خواتین کی تعلیم، ص۔۱۰۲)

لیکن اس کے باوجود بھی دیگر حقوق کی طرح عورتوں کے ساتھ یہاں بھی زیادتی کی گئی۔عورتوں کو اس دولت سے محروم رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔اس طرح لاعلمی کے باعث بھی عورتوں کا ایک طویل عرصے سے استحصال کیا گیا۔جبکہ مذہب اسلام میں عورت کی تعلیم پر زور دیا گیا اور یہ حق مرد و عورت دونوں کو یکساں طور پر حاصل ہے۔مگر اس کے باوجود بھی مرد حاوی سماج کے دل و دماغ میں یہ بات پیوست ہے کہ عورت کی جگہ گھر کی چہار دیواری کے اندر ہے، علم و فن ان کے لیے بے معنی اشیا کے مانند ہے۔حالانکہ آج قدیم زمانے کا وہ دور نہیں رہا پھر بھی عورتوں کی تعلیم کو آج بھی بہت جگہوں پر معیوب سمجھا جاتا ہے اور بیٹیوں کی تعلیم پر بندشیں لگائی جاتی ہیں۔اکبرآلہٰ آبادی ان سماجی بندشوں کو عورت کے حق کے لیے اچھا تسلیم کرتے ہے۔ان کے نزدیک مشرقی عورت کے لیے یہی زیب دیتا ہے۔مثال کے طور پر عورت کی تعلیم جو ایک عورت کا بنیادی حق ہے لیکن اکبرالہ آبادی موڈرن تعلیم کو عورت کے لیے صحیح نہیں مانتے۔اکبرالہٰ آبادی کے تصور تعلیم نسواں کا مطالعہ کرنے پر ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر نے اپنی شاعری میں جا بجا عورتوں کی تعلیم پر طنز کیا ہے۔ان کا خیال تھا کہ تعلیم خصوصاً انگریزی تعلیم عورتوں کو بے شرم بنا دے گی۔وہ گھر کی چار دیواری میں قید رہنے کے بجائے آزادانہ گھومتی پھریں گی یہی وجہ تھی کہ وہ عورتوں کو انگریزی تعلیم دینے کے سخت مخالف تھے جس کا اظہار وہ اپنے اشعار میں کچھ یوں کرتے ہیں:

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن، پہلے چراغ خانہ تھی

پردہ اُٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں

اکبرالہٰ آبادی کو یہ خوف تھا کہ اگر عورتیں انگلش کی پڑھائی کریں گی یا انگریزی اطوار سیکھیں گی تو ہماری تہذیب نیست و نابود ہو جائے گی، شرم و حیا کی جگہ بے شرمی لے لے گی، اکبر اس واعظ کی طرح ہیں جو انسان کے دل میں ان ہونی کا خوف پیدا کرتے رہتے ہے اور عقبیٰ کا واسطہ دے دے کر دنیا سے بھی واقف ہونے نہیں دیتے۔انھیں یہ تصور ہی لرزا دیتا ہے جب پڑھی لکھی لڑکیاں سڑک پر نکلیں گی تو منظر کیسا دلخراش ہوگا اپنے اس خوف کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے شعری پیرائے میں بیان کیا، اشعار ملاحظہ فرمائیں:

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
دل کش و آزاد و خوش رو، ساختہ پر داختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقعے عمل کے ہوں گے پیش
ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بے ساختہ

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا اکبر کے نزدیک عورتوں کا انگریزی تعلیم حاصل کرنا بے حیائی کی علامت ہے۔ جس کا ذکر انھوں نے طنز و مزاح کے انداز میں اپنے کلام میں جا بجا کیا، وہ تعلیم نسواں کو روشن خیالی یا بہتر مستقبل کے نظریے سے نہیں دیکھتے تھے، ان کے دماغ میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ اگر عورتیں پڑھ لکھ لیں گی تو ہمارے معاشرے میں بے شرمی عام ہو جائیں گی، اپنے اس خوف کو انھوں نے کچھ اس انداز میں پیش کیا اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میں بھی گریجویٹ ہوں ، تو بھی گریجویٹ
علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آ کے لیٹ
دونوں نے پاس کر لیے ہیں سخت امتحاں
ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بد گماں

صغریٰ مہدی نے اپنی کتاب میں بیگم خواجہ حسن نظامی سے لیے گئے ایک انٹرویوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بقول بیگم خواجہ حسن نظامی، اکبر عورتوں کی تعلیم کے مسئلے پر اکثر گفتگوں کرتے تھے:

"اکبر کہتے کہ میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں۔ انھیں تعلیم ملنی چاہئے۔ انھیں مذہب سے واقفیت ہونا بھی ضروری ہے۔ حفظانِ صحت کے اصولوں سے بھی واقف ہونا چاہئے۔ حساب کتاب بھی آنا چاہیے اور اخلاقی اور سبق آموز کتابیں بھی ان کے مطالعے میں رہنی چاہئے تاکہ وہ اپنے بچوں کی اچھی تربیت کر سکیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے تو مخالف نہیں تھے، مگر اس حق میں تھے کہ عورتوں کو وہی تعلیم حاصل کرنا چاہئے جو امور خانہ داری، بچوں کی تربیت اور شوہر کی رفاقت میں معاون ثابت ہوں۔"

(اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۸۱ ص ۲۷)

روسو (Rousseau) اور اکبر کے خیالات، زمانی بعد کے باوجود ایک سے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں روسوں کا کہنا تھا کہ:

" The first and most important quality of a women is gentleness. Made to obey a person as amperfect as man, often so full of vices,and always so full of faults, She ought early learn to suffer even injustice, and to endure th wrongs of a husband without complaints,and it is not for him but for herself that she ought to be gentle.

[Rousseau's Emile, p:270.,By William.H.Pane]

ایک دوسری جگہ روسو کہتا ہے کہ:

to be relative to men. To please them, to be useful to them to make themselves loved, and honored by them when grown, to counsel them, to console them, and to make life agreeble and sweet to them these are the duties of women at all times, and what should b taught them from their infancy."

[Rousseau's Emile, P: 263]

روسو کے اس خیال کے مطالعہ سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روسو کی طرح اکبر بھی روسو کی طرح عورت کی زندگی کا مقصد مرد کی خدمت اور غلامی سمجھتے تھے۔اکبر کے نزدیک عورت کی زندگی گھر کی چہار دیواری تک محدود ہے، جن کی زندگی کا مقصد بچے پیدا کرنا، ان کی پرورش کرنا اور شوہر کی فرمانبرداری کرنا ہے۔انھوں نے خالص ہندستانی مسلم معاشرے کی تصویر کو پیش کیا۔جو ان کے نزدیک ایک عورت کا صحیح مقام ہے۔ان تمام خیالات کو انھوں نے شعر کے قلب میں کچھ اس طرح ڈھالا ہے، کہتے ہیں:

تعلیم عورتوں کی ضروری تو ہیں مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اس کے علاوہ اکبر نے قدم قدم پر عورت کو پردے میں رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ان کے خیال میں ایسے مرد بے وقوف ہیں، جو عورت کو پردے سے باہر نکالنا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک قوم کی ترقی کا راز بھی پردگی میں ہی مضمر ہے اشعار ملاحظہ فرمائیں :

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا
پردہ اُٹھ جانے سے اخلاق ترقی قوم کی
جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ

اکبر اپنی شاعری میں دو طرح کی عورت کا تصور پیش کرتے ہیں پہلی مشرقی اور دوسری مغربی۔ان کے نزدیک مشرقی عورت قابل احترام ہے لیکن دوسری طرف مغربی عورت مالِ مفت ہے۔وہ مشرقی عورت کو ستر پردے میں چھپا کے رکھنا چاہتے ہے لیکن مغربی عورت کے حسن سے آنکھیں سینکنے کی تمنا رکھتے ہیں مغربی عورت کو دیکھتے ہی ان کی رال ٹپک پڑتی ہے۔مغربی تہذیب وتمدن کا مذاق اڑانے کے جوش میں انھوں نے مغربی عورت کی جو تصویر پیش کی ہے وہ نا قابل قبول ہے، وہ مغربی عورتوں کا مذاق بنانے کے جوش میں حد بھی پار کر جاتے ہیں۔وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ عورت تو عورت ہوتی ہے خواہ وہ مشرقی ہو یا مغربی، یہاں ان کے دل میں عورت کے تصور کی ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جو غیر منصفانہ ہے ایک طرف تو وہ عورت کی عزت کو بے پردہ ہونے سے بچانے کے لیے انگریزی تعلیم سے دوری بنانے کا مشورہ دیتے ہیں تو دوسری طرف مغربی عورتوں کے حسن و جمال کو ڈھال بنا کر بے حرمتی کرنے سے بھی باز نہیں آتے، جس کی عمدہ مثال ان کی نظم ''برق کلیسا'' میں دیکھی جاسکتی ہے، اکبرالہ آبادی کے ان نظریے کی نمائندگی کے لئے ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں :

ممکن نہیں ہے اے مس ترا نوٹس نہ لیا جائے
گال ایسے پری زاد ہوں اور کِس نہ لیا جائے
تھی میرے پیش نظر وہ بہت تہذیب پسند
کبھی وہسکی مجھے دیتی تھی کبھی شربتِ قند

اکبرالہ آبادی کے طنز و مزاح کو 1857 کے بعد کے دور کے پس منظر میں سمجھنا بہت ضروری ہے تبھی ان کے افکار ونظریات کو صحیح معنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔اکبر کی شاعری کے عروج کا زمانہ ہندستان میں مغربی تہذیب و معاشرت کے عروج کا زمانہ ہے ہندستان بیرونی مداخلت کے تسلط کے شکنجے میں بری طرح کستا جا رہا تھا اور اہل مغرب کا جادو ملک وقوم پر چھا رہا تھا۔ان سب حالات سے اکبر بے چین ہوا تھے۔ان کو برسوں سے چلی آرہی ہندستانی تہذیب وثقافت، معاشرتی نظام کا

تانہ بانہ بکھرتا نظر آیا۔ جسے بچانے کے لیے انھوں نے اپنی شاعری میں طنزیہ اسلوب کا سہارا لیا اور موڈرن معاشرے کے خلاف طنز کرنا شروع کر دیا۔

مغرب نے خورد بیں سے کمر ان کی دیکھ لی
مشرق کی شاعری کا مزاہ کرکرا ہوا
دعویٰ بہت بڑا ہے ،ریاضی میں آپ کو
طول شب فراق ذرا ناپ دیجیے

اکبرالہ آبادی مغربی عورتوں کو بدقماش اور بدکردار ثابت کرنے پر کمر بستہ نظر آتے ہیں۔ انھیں ایسا لگتا ہے کہ ساری انگریز عورتیں دن رات ہوٹل میں تاش کی بازی کھیلتی رہتی ہیں اور انھیں ہر وقت عاشقوں کی تلاش رہتی ہے، ان کی زندگی کا بس ایک ہی مقصد ہے عیش پرستی، جس کے لیے وہ ہر گناہ کا کام بڑی آسانی سے کرتی ہیں، اکبرالہٰ آبادی کے اس خیال کی عکاسی کے لیے ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں :

لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز وطریق
ہال میں ناچو، کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش
بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش

''نقوش'' آپ بیتی نمبر میں محمد عبدالرزاق کانپوری کے مطابق اکبر نے ظریفانہ شاعری اس لیے کی تھی کہ ''اودھ پنچ'' کی فرمائش پوری کرنا چاہتے تھے، کہتے ہیں:

''میں نے سید اکبر حسین سے ایک موقعہ پر سوال کیا کہ آپ جیسے مذہبی شخص نے ظریفانہ شاعری کیوں اختیار کی اور سرسید اور کالج کے خلاف مضامین کس بناء پر لکھنا شروع کیے۔ ہنس کر فرمایا کہ یہ رنگ اودھ پنچ کے مضامین کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اور ظریفانہ مذاق بھی اس زمانے کے ماحول کا نتیجہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ شہرت و ناموری کا ذریعہ اس عہد میں اخباری مضامین ہی تھے۔ لہٰذا اکبر حسین سے جو غلطی ہوئی وہ معافی کے قابل ہے۔ اور مجھے بھی یہ خبر ہے کہ اخیر دور میں سید اکبر حسین کے احباب نے بھی ان کو سرسید کی اور کالج کی مخالفت سے منع کیا تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری کا رنگ اس کے بعد بدل گیا تھا۔''

(نقوش۔ آپ بیتی نمبر، جون،۱۹۶۴، مدیر: محمد طفیل۔ لاہور۔ ص: ۴۲۹۔۴۲۸)

خالص مشرقی فکر کو فروغ دینے کے ساتھ اکبر نے اپنے چند اشعار میں آزادیٔ نسواں اور مغربی طرز معاشرت کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن مشرقی عورتوں کا مغربی تعلیم اور طرز فکر کو اپنانے کے شوق کی مذمت بھی کیں اور فکر میں یہاں تک کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

اکبر نے ہمیشہ اپنی شاعری میں طنزیہ اسلوب کو اپنے کلام کو موثر بنانے کے لیے کیا۔ انھوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جب مغربی تہذیب کو اپنانے میں شرم وحیا، تہذیب وثقافت جب خطرے میں پڑ سکتی ہے تو اسے کیوں اپنایا جائے اپنا یہ پیغام ہر عام وخاص کو وہ دینا چاہتے تھے جس کے لیے انھوں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ:

پردہ اٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں
پریوں کا شوق ہے نہ مجھے فکر حور ہے
کالج سے ہے نجات تو ذکر حضور ہے

اکبر کو یہ علم بہت اچھے سے تھا کہ ایک عورت ہی گھر کو سنوارتی ،سجاتی اور آنے والی نسل کی تربیت کرتی ہے ۔اس لیے اگر سماج و معاشرے کی بنیاد مضبوط بنانی ہے تو شروعات گھر سے ہی کرنی ہوگی۔ کیونکہ گھر کی عورت گھر کا ماحول، تعلیم وتربیت ہی وہ اشیا ہیں جو ایک عام

انسان کو خاص بناتی ہے۔ اکبر علامہ اقبال کے تصورِ زن سے بہت متاثر تھے یہی وجہ ہے کہ عورت کے مضبوط تصور کو اکبر نے اقبال کے حوالے سے پیش کیا۔ انھوں نے والدین اور بچوں کے رشتے ان کی خوبیوں کا بھی اعتراف واظہار اسی انداز میں کیا جیسا کہ اقبال نے کیا۔ اکبر فرماتے ہیں:

حضرت اقبالؔ میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے اہل دل تھے صاحب اسرار تھے

اکبر اقبال کے تصورِ نسواں سے بہت متاثر تھے۔ کیونکہ کلام اقبال میں مختصر ہی سہی لیکن اقبال نے تعلیم نسواں، تربیت نسواں، تصور نسواں جیسے اہم موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ اقبالؔ کے نزدیک عورت کا حقیقی مقام، جس سے امت اسلامیہ کی تعمیر وترقی کی امیدیں وابستہ رکھی جاسکتی ہیں نہ تو اندھی تقلید کے تحت عورت کو جہالت میں مقید رکھنا ہے اور نہ عورت کا تہذیب کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانا، بلکہ حقیقی مقصد شرف نسوانیت ہے۔ قدرت نے عورت کو نوع بقا کا ضامن بنایا ہے۔ اس کے وجود سے دنیا قائم ہے۔ اقبال بھی عورت کی اس مسلمہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ میں انھیں کلمات کے ساتھ اپنی باتوں کا اختتام اقبال کے اس پیغام کے ساتھ کرنا چاہوں گی کہ:

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش

علامہ اقبال عورتوں کو فاطمۃ الزہرا کے کردار کو اپنانے اور ان کی تربیت کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ آج کے زمانے کی عورتیں فاطمۃ الزہرہ جیسی مثالی ازواج مطہرات کی زندگی کو اپنانے کی بجائے بے شرمی، بے پردگی اور مردوں کو بہلانے والی ناز وانداز اداؤں کو اپنا زیور سمجھتی ہیں۔ اپنی بے غیرتی کو فیشن سمجھنے والی عورتوں کو اقبال اپنی نظم ''غلام قادر رہیلہ'' میں یوں خطاب کرتے ہیں:

دیا اہل حرم کو رقص کا فرماں ستم گر نے
یہ انداز ستم کچھ کم نہ تھا آثار محشر سے
یونہیں کچھ دیر تک محو نظر آنکھیں رہیں اس کی
کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بار مغفر سے

علامہ اقبال کے ان تمام افکار سے اکبر الہٰ آبادی بھی اتفاق رکھتے تھے۔ جس کا اعتراف انھوں نے اپنے کلام میں بھی کیا۔ بہرحال اکبر الہٰ آبادی ایک ممتاز شاعر تھے، ان کی شاعرانہ بصیرت سے انکار ممکن نہیں۔ بھلے ہی وہ عورتوں کو جدید تعلیم دینے کے مخالف تھے، لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کے سینے میں اپنی قوم کے لیے، اپنی تہذیب وثقافت کے لیے بے پناہ محبت تھی، وہ اپنے کلچر کو کبھی مٹتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے، وہ ایک دردمند دل حساس شاعر تھے، عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں ان کے نظریات سے اتفاق تو نہیں کیا جا سکتا لیکن تہذیب وثقافت کی حفاظت کرنے کا ان کا پیغام ہم سب پر ضرور وعائد ہوتا ہیں۔

☆☆☆

اکبرالہ آبادی کا تصورِ نسواں، عورت نامہ کے حوالے سے

ڈاکٹر محمد تابش خان

ڈاکٹر تابش خان (جز وقتی اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو ممبئی یونی ورسٹی)، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی سے عربی میں ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کرنے کے بعد ممبئی یونیورسٹی شعبۂ عربی سے ڈاکٹر جمشید احمد ندوی کی نگرانی میں پوسٹ ڈاکٹریٹ کیے۔ دیگر تعلیم: مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ سے فضیلت، مدراس یونی ورسٹی سے اردو میں ایم۔اے، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے فارسی میں ایڈوانس ڈپلوما اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی سے صحافت میں ایڈوانس ڈپلوما کیے ہیں۔ آپ کی چار کتابیں اہل نقد و نظر سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

Email : tabishkhan05@gmail.com / Mob : +91 9891144521

اکبرالہ آبادی (1846-1921) نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسے شخص کا تصور ابھرتا ہے جس کو کسی نے مصلح قوم بتایا تو کسی نے طنز و مزاح کا شہنشاہ قرار دیا۔ اکبرالہ آبادی اُردو ادب میں باضابطہ طنز و مزاح کے پہلے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اور ہم سبھی بخوبی واقف ہیں کہ ہر ادیب اپنی زندگی میں الگ الگ طریقے سے کام کرتا رہتا ہے، اور اکبرالہ آبادی نے بھی اپنی ایک منفرد راہ اختیار کی تھی۔ اکبر طنز و مزاح کی شاعری کے ذریعہ قوم کو برائیوں سے باہر نکالنے کی اور قوم کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے قطعی انکار ممکن نہیں کہ وہ اصلاح ملت کے عظیم علمبردار تھے۔ وہ مزاحیہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید فلسفی شاعر بھی تھے۔ اکبر نے اپنے عہد میں نہ مولویوں کو منہ لگایا نہ مغرب کی برکات سے مرعوب ہوئے، نہ انگریز حاکموں کی پروا کی اور نہ لیڈروں کو خاطر میں لائے۔ اس عہد میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے انگریز کا ملازم ہوتے ہوئے اس کی ایسی خبر لی ہو جیسی اکبر نے لی۔ اکبر روایتی ہوتے ہوئے بھی باغی تھے اور باغی ہوتے ہوئے بھی اصلاحی۔ اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعے طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھایا اور اردو شاعری میں اپنے اسلوب، موضوعات اور زبان سے گرانقدر اضافہ کیا۔ اکبر نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہی کی، اس کے علاوہ انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف پر بھی طبع آزمائی کی۔ مثلاً غزل، قطعات، رباعیات، نظمیں اور بے قافیہ نظمیں وغیرہ۔ اکبر کی شاعری کے ابتدائی کلام میں رنگینی ہے، شوخی ہے، غزل کے روایتی لب و لہجے میں ہجر و وصال کے بیان ہیں مگر وقت کے ساتھ ان کی غزلوں میں اعلیٰ مضامین کے علاوہ گہرائی اور تہ داری آتی گئی۔ اکبر کی غزلیں ان کی شاعری کی خصوصیات کی آئینہ دار ہیں۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری کو لوگوں نے مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ شاعری کے مطالعے کے اعتبار سے ہم تین دور میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور ان کی روایتی شاعری کا ہے جس میں انھوں نے بہترین غزلوں سے اردو ادب کو مزین کیا۔ اکبر کی شاعری کا دوسرا دور اودھ پنچ کے جاری ہونے سے شروع ہوتا ہے جو کہ لکھنؤ سے ''لندن پنچ'' کے جوڑ پر 'اودھ پنچ' ایک پندرہ روزہ اخبار نکلنا شروع ہوا تھا جس کا مقصد معاشرے کی غلط رسم و رواج کو طنز و مزاح کا نشانہ بنانا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ

طنزیہ ومزاحیہ انداز میں برطانوی حکومت پر وار کرتا تھا۔ اکبر نے اس اخبار میں کبھی نظم کبھی نثر میں سیاسی اور سماجی مسئلوں پر طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں اپنی انفرادی شان پیدا کرلی اور بہت مقبول ہوئے۔ اکبر کی شاعری کا تیسرا اور آخری دور بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے جہاں اکبر کی شاعری اور خیالات میں نمایاں فرق دکھائی پڑتا ہے اور اکبرالہ آبادی ایک منفرد شاعر نظر آتے ہیں۔

اکبرالہ آبادی کا ایسا زمانہ تھا جہاں ہندوستانی معاشرے میں ہر قسم کی تبدیلیاں بہت تیزی سے رونماں ہو رہی تھیں، جہاں ایک تہذیب کی بساط اٹھ رہی تھی وہیں دوسری تہذیب اپنا رنگ جما رہی تھی۔ وقت کے ساتھ ادب وشاعری کا تصور بھی بدل رہا تھا۔ اکبر کے ذہن میں بھی یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ پرانے انداز کی شاعری اب بے وقت کی راگنی ہونے لگی ہے۔ ایک طرف تو حکمراں قوم کے ظلم وستم، جبر واستحصال پر اکبر کو غم وغصہ تھا تو دوسرے معاشرے میں ان کو افراتفری نظر آرہی تھی۔ جس سے ایک مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو رہی تھی۔ کیونکہ انگریز نہ صرف سیاسی طور پر اپنا قبضہ جمارہے تھے بلکہ تہذیبی طور پر اس کو اپنا غلام بنا رہے تھے۔ ان کا رعب ودبدبہ اس قدر تھا کہ ان کے خلاف آواز اٹھانے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ انھیں سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے اکبرالہ آبادی نے اپنی شاعری میں اکثر سماجی برائیوں، مغربی تہذیب وغیرہ کو طنز ومزاح کے پیکر میں ڈال کر تنقید کا نشانہ بنایا اور معلوم پڑتا ہے کہ اکبرالہ آبادی ایک فلسفی اور حکیم کی طرح قوم کو نصیحت کرتے ہیں اور دنیاوی ضرورتوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کی اس طرز شاعری کی یہ خوبی ہی ہے کہ لوگوں کی انا کو ٹھیس بھی نہیں پہنچتی اور محاسبہ کرنے پر مجبور بھی ہوجاتے ہیں، مثلاً ملاحظہ ہو:

دنیا میں لذتیں ہیں نمائش ہے شان ہے
ان کی طلب میں حرص میں سارا جہان ہے
اکبر سے سنو کہ جو اس کا بیان ہے
دنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے

(عورت نامہ، ص۱۶)

موضوع نسواں اکبرالہ آبادی کی شاعری کا خاص موضوع رہا ہے۔ اور اکبرالہ آبادی کے عورتوں کے متعلق کلام کے انتخاب کو ''عورت نامہ'' میں حضرت خواجہ حسن نظامی نے یکجا کردیا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر اپنی شاعری میں دو طرح کی عورت کا تصور پیش کرتے ہیں۔ ایک مشرقی، دوسری مغربی اور ''عورت نامہ'' میں اکبر نے عورتوں کی عظمت میں بڑے خوبصورت اشعار کہے ہیں، حضرت فاطمہ کے بارے میں اشعار ملاحظہ ہو:

جناب فاطمہ کے مرتبے کا کیا کہنا
ہمیشہ چاہیے ان پر درورد خواں رہنا
جناب حیدر کرار کی وہ ہیں بی بی
حسن حسین کی ماں ہیں رسول کی بیٹی

(عورت نامہ، ص۱۰)

جہاں حضرت فاطمہ کے بارے میں خوبصورت اشعار کہے ہیں وہیں اکبرالہ آبادی نے عورتوں کی چار دیواری کی قید کے اوپر بھی لاجواب اشعار کہے ہیں ملاحظہ ہو:

فرض عورت پر نہیں ہے چاردیواری کی قید
ہو اگر ضبط نظر کی اور خودداری کی قید
ہاں مگر خودداری و ضبط نظر آساں نہیں
منہ سے کہنا سہل ہے کرنا مگر آسان نہیں

(عورت نامہ، ص۴)

اکبرالہ آبادی نے عورتوں کی تعلیم اور شوہر کے بارے میں طنز و مزاح کے انداز میں فرماتے ہیں کس طرح ہندوستانی عورتیں اپنے شوہروں کی مددگار ہیں، شعر ملاحظہ ہو:

یہاں عورتوں کو علم کی پروا نہیں بیشک
مگر یہ شوہروں سے اپنے بے پرواہ نہیں ہوتیں

(عورت نامہ، ص ۷)

اور کئی دفع اکبرالہ آبادی کو بدنام بھی کیا جاتا رہا ہے کہ وہ تہذیب جدید کے دشمن تھے اور عورتوں کے معاملے میں ان کے خیالات نہایت متعصبانہ تھے۔ مگر ''عورت نامہ'' کے انتخابی اشعار کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ہر طرح کے خیالات ملتے ہیں۔ دراصل اکبر دور جدید کی تبدیلیوں کو برداشت نہیں کر پاتے تھے کیوں کہ وہ قدیم روایات کے پاسبان و حامی تھے یہی وجہ ہے کہ اکبر نے جدید تہذیب اور نام نہاد تعلیم نسواں کی دلدادہ عورتوں کو نشانہ بنایا ہے جو مغربیت کا دم بھرتی ہیں اور اس دھارے میں بہتی چلی جاتی ہیں۔ اکبر نے اپنی شاعری میں جا بجا عورتوں کی تعلیم پر طنز کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہو:

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

(عورت نامہ، ص ۹)

کون کہتا ہے علم زناں خوب نہیں
ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دوا سے شوہرو اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

(عورت نامہ، ص ۹)

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے
خدمت میں وہ لیزی اور ناچنے کو لیڈی

تعلیم کی خرابی سے بالآخر
شور پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

(عورت نامہ، ص ۱۰)

ان سے بی بی نے فقط اسکول کی ہی بات کی
یہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

(عورت نامہ، ص ۱۴)

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

(عورت نامہ، ص ۱۴)

نام نہاد تعلیم نسواں کی دلدادہ عورتوں پر نشانہ لگانے کے ساتھ ساتھ اکبر نے مغرب زدہ خواتین کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اکبرالہ آبادی کو عورتوں کی بے پردگی سے سخت نفرت تھی ان کے نزدیک مغربی تہذیب کے اثرات نے عورتوں سے حیا کی چادر چھین لی ہے اور وہ رونق محفل بن گئی ہیں۔ اکبر کا خیال تھا کہ ہندستانی عورت کو اگر مغربی طرز پر تعلیم دی گئی اور اس کو اسی طرح کی آزادی ملی تو وہ اپنی مشرقیت کھودے گی۔ عصمت و عفت کی حفاظت نہ کر سکے گی۔ اکبر فیشن زدہ خواتین کے متعلق کیا بیان کرتے ہیں ان اشعار کو دیکھیے:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑگیا

(عورت نامہ، ص ۱۲)

وہ شوکت و شان زندگانی نہ رہی
عزت کی حرم میں پاسبانی نہ رہی
پردہ اٹھا تو کھل گیا اے اکبر
اسلام میں اب لن ترانی نہ رہی

(عورت نامہ، ص ۱۲)

عورتوں کی تعلیم وتربیت کے خلاف اکبرالہ آبادی پر جوالزام لوگ لگاتے ہیں وہ بالکل بھی صحیح نہیں بلکہ اکبردرحقیقت عورتوں کی تعلیم وتربیت کے حامی تھے، وہ آزادیِ نسواں کی اس مخصوص تربیت کے مخالف تھے جو مغربی تعلیم حاصل کرکے عورتیں اپنالیتی ہیں۔ اکبرخودہی فرماتے ہیں کہ:

"میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں۔ انھیں تعلیم ملنی چاہیے۔ انھیں مذہب سے واقفیت ہونا بھی ضروری ہے۔ حفظانِ صحت کے اصولوں سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ حساب کتاب بھی آنا چاہیے اور اخلاقی اور سبق آموز کتابیں بھی ان کے مطالعے میں رہنی چاہیے تاکہ وہ اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرسکیں۔"

(اکبرکی شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹرصغریٰ مہدی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ ۱۹۸۱ء، ص ۔۴۷)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے تو مخالف نہیں تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم کی حمایت میں انھوں نے ایک نظم بھی لکھی جس میں انھوں نے اس کی وضاحت کی کہ عورتوں کو کس قسم کی تعلیم ملنا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا معمول اور ہے

(عورت نامہ، ص ۱۶)

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں
ایک ہی بات کہنی ہے یاں حکمت کو
دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

(عورت نامہ، ص ۹)

ان کی ایک نظم جو حسن نظامی کی لڑکی 'حور بانو' کو اس کی شادی کے وقت بطور جہیز کے اکبرالہ آبادی نے عطا فرمائی تھی، اس کی بہترین مثال ہے جس میں انھوں نے انتہائی ناصحانہ انداز میں عورتوں کو مخاطب کیا ہے:

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
حسن معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بیشک قصور ہے
ان پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بند و بست
چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شاد و مست

(عورت نامہ، ص ۱۵)

اکبرالہ آبادی مغربی تہذیب کے اثرات کے مخالف تھے، لیکن انھوں نے انگریزی زبان یا مغرب کی اچھی چیزوں کو اختیار کرنے سے منع نہیں فرمایا، انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا انگریزی الفاظ کا خوب استعمال بھی کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

کر لیا بی بی نے انٹرنس اس سال پاس
والدہ صاحب تو ہیں خاموش لیکن خوش ہیں ساس

(عورت نامہ، ص ۵)

نکلا بآب و تاب بنارس سے اولڈ بائے
اللہ اس کو گولڈ بھی دے اور پرل بھی

خواہش ہے اب یہ محبان قوم کی
نکلے کسی طرف سے یوں ہی، اولڈ گرل بھی
(عورت نامہ، ص ۷)

اکبر طنز و مزاح کے بہت بڑے شاعر تھے ان کی طنزیہ مزاحیہ شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ وہ اس زمانے کی سیاست کا آئینہ دار ہے۔ اکبر نے اردو میں پولیٹکل سٹائر کی روایت کو آگے بڑھایا اور اس کا ایک معیار قائم کیا۔ انگریز حکومت کی پالیسی، کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست کے اتار چڑھاؤ، گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون، زبان کا جھگڑا، جلیان والا باغ کا حادثہ، خلافت تحریک، اکبر نے ان سب کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا۔ حکومت وقت پر اکبر نے جس طرح کھل کر تنقید کی اور برٹش سامراج کے ہر پہلو پر طنز کیا ہے اور مزاح کے پیرائے میں اس پر تنقید کی ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اکبر کی شاعری کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کی شاعری اپنے دور کی تہذیبی تصادم اور سماجی تبدیلیوں کی بہترین ترجمان ہے۔

جہاں اکبرالہ آبادی ایک لاجواب شاعر تھے وہیں پر وہ ایک بہترین نثر نگار اور مترجم بھی ہیں۔ انھوں نے کئی چیزوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ حالانکہ کی نثر میں کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے مگر ان کے خطوط اور چھوٹے بڑے مزاحیہ اور سنجیدہ مضامین اودھ پنچ میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جو انھوں نے اردو ادب کے مشاہیر کے نام لکھے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں اردو ہندی جھگڑا شروع ہو چکا تھا۔ یہ تنازعہ انگریزوں نے ہندو مسلمان کے درمیان تفرقہ ڈالنے کے لئے کیا تھا۔ اس موضوع پر اکبر نے ایک مفصل مضمون لکھا جو کسی فرضی نام سے شائع ہوا تھا کیوں کہ اکبر سرکاری نوکر تھے۔ اس رسالے کا ذکر انھوں نے عبدالماجد دریابادی کے نام خطوط میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے بھی ایک بڑا مضمون لکھا تھا وہ 'ایک واقف کار مسلمان' کی رائے میں چھپا تھا۔ کیوں کہ میں اس وقت مرزا پور میں سیشن جج تھا اور سر اینٹی میکڈانل کی گورنمنٹ حامی ہندی تھی اس سبب سے میرا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔

دراصل اکبر کے سینے میں اپنی قوم کے لیے، اپنی تہذیب و ثقافت کے لیے بے پناہ محبت تھی، وہ اپنی ثقافت کو کبھی مٹتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اکبر کی شاعری میں اخلاقیات کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اکبر نے زندگی کے ہر شعبے پر اپنے مخصوص رنگ میں اظہار خیال کیا ہے، زندگی کے کسی بھی غلط پہلو کو اپنی تیکھی تنقید سے نہیں بخشا۔ مذہب، تعلیم، اخلاقیات، تہذیب وتمدن اور سیاست و معاشرت سمیت سبھی پر انھوں نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور تنقید کے تیز نشتر چبھوئے ہیں۔ اکبر کو زبان و بیان اور اسلوب کا گہرا شعور تھا اسی شعور کے رچاؤ نے ان کی مزاحیہ شاعری میں شان پیدا کی اور انھیں ہر مکتب فکر میں مقبول خاص و عام بنا دیا۔

☆☆☆

اکبرالہ آبادی کے کلام میں وطنیت وقومیت

مختاراحمد میر

سینٹرل یونی ورسٹی آف کشمیر کے شعبۂ اردو میں ریسرچ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مارچ ۲۰۱۹ میں ایم فل کی ڈگری شعبۂ ہذا سے حاصل کی۔ آپ کی دلچسپی کا میدان افسانوی ادب اور غیرافسانوی ادب بالخصوص انشائیہ ہے۔

Email:mirmukhtar00@gmail.com / Mob :7006418647

ہے قوم جسم سلطنت اس میں ہے مثلِ روح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے

اکبرالہ آبادی

الہ آباد کے قصبہ بارہ میں پیدا ہونے والے سید اکبر حسین المعروف اکبرالہ آبادی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء) کولسان العصر کا لقب دیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے عصری رجحانات کو زبان دی ہے۔ غرض انہوں نے اپنے کلام میں ہندوستانی قوم کی نصف صدی کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشی حالات بیان کیے ہیں۔ یوں تو اکبر نے سنجیدہ شاعری بھی کی ہے لیکن ظریفانہ انداز ان کی شاعری کا خاصہ ہے اور انہیں کے حصے کی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ بھی سرسید احمد خان کی طرح اپنے وطن اور قوم کے مصلح تھے۔ اگر چہ اکبرالہ آبادی مغربی تہذیب وتعلیم کے دلدادہ سرسید احمد خان کے مخالف تھے لیکن دونوں شخصیتوں پر گہری نظر رکھنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان کا اختلاف شخصی نہیں بلکہ نظریاتی تھا۔

الہ آباد کا نام ابھی حال ہی میں اتر پردیش حکومت نے تبدیل کر کے پریاگ راج رکھ دیا ہے، جس سے ہماری آنے والی نئی نسل کو یہ سمجھنے میں دشواری ہوگی کہ اکبر کس شہر کا باشندہ تھا اور ان کے نام سے الہ آبادی کا ظرفِ مکاں کس جگہ کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن اکبرالہ آبادی جیسے ممتاز شاعر کی ظریفانہ شاعری نے اس تاریخی شہر (موجودہ پریاگ راج) کو ایک ادبی تشخص عطا کر کے لازوال کر دیا۔

قومیت وطن سے وابستہ ہوتی ہے، اس لیے وطنیت اور قومیت قریب قریب ہم معنی ہیں۔ قومیت اور وطنیت میں ہر وہ چیز شامل ہوتی ہے جس کا رشتہ قوم اور وطن سے ہو جیسے: مذہبی رجحانات، قومی اتحاد، احساسِ آزادی، سماجی اقدار، تہذیب وتمدن، رسم ورواج، تاریخی عوامل، جغرافیائی حدود وغیرہ ایسے موضوعات ہیں، جنہیں قومیت اور وطنیت سے جوڑا جا سکتا ہے۔ ان کا ذکر کرنا یا ان سے پیدا ہونے والے حالات سے اثر قبول کرنا ایسے محرکات ہیں، جن پر ہمارے جذبۂ قومیت اور وطنیت کی بنیاد ہے۔ ایک ادیب یا شاعر اپنے عہد کے بنیادی مسائل سے کبھی آنکھیں نہیں چرا سکتا۔ اس کی حساس طبیعت اسے سماج کے

بنیادی مسئلوں کی طرف راغب کرتی ہے، جس سے اس کے دور کی مذہبی، تہذیبی، تاریخی اور سماجی اقدار اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

یوں تو وطنیت اور قومیت کے جذبوں سے اردو شاعری ابتدائی دور ہی سے آباد رہی ہے لیکن دیکھا جائے تو ان جذبوں میں تیزی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہی سے آئی ہے، کیوں کہ تاریخ ہند میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بڑے گہرے اثرات رہے ہیں۔ چوں کہ یہاں میرا مقصد نہ اس جنگ کے اسباب سے ہے اور نہ ہی اس کی ناکامی سے البتہ اس کے بعد ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی، جس کی وجہ سے ہندوستان کا سیاسی نقشہ ہی نہیں بلکہ تہذیبی، اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی، سماجی اور بڑی حد تک مذہبی نقشہ بھی بدل گیا۔ اس لیے ہندوستان میں کچھ مصلح پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ایک جماعت نے یہ سوچنا شروع کیا کہ نئی تہذیب سے نفرت کرنے سے کام نہیں چلے گا اور مغربی علوم حاصل کیے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے۔ نئے زمانے میں اب ہم کیسے رہیں؟ یہ جاننا چاہیے۔ اگر ہم پرانی لکیروں پر چلتے رہے تو ہم ترقی یافتہ قوموں سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اس طرح کے لوگوں میں سرسید احمد خان اور راجہ رام موہن رائے سرفہرست ہیں۔

دوسری جماعت کا خیال تھا کہ مذہبی علوم کے حصول ہی سے ہندوستان کی فلاح ممکن ہے۔ ایک گروپ ایسا تھا جو ہندستان کی تہذیبی شناخت کو اہم جانتا تھا۔ یہ گروپ جدید تعلیم کا مخالف نہیں تھا لیکن اقدار کی شکست و ریخت، اس گروپ کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اکبرالہ آبادی اس گروپ کے علم بردار تھے۔ ان کی وطنیت اور قومیت کو اسی پس منظر یعنی مشترکہ تہذیبی اقدار کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے روکنا اور مغربی یا انگریزی تہذیب سے بیزاری اور سرسید تحریک کی مخالفت ہی میں سمجھنا ہوگا۔

اردو شعر و ادب کی حد تک اکبرالہ آبادی ان تبدیلیوں کے سب سے بڑے مبصر بھی ہیں اور مفسر بھی۔ انہیں اگر اردو کا خالص قومی شاعری کا پیش رَو بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اگر چہ اکبر نے سنجیدہ شاعری بھی کی ہے لیکن ان کی عظمت تو اُس شاعری سے ہے، جس میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی چاشنی غالب عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ اکبرالہ آبادی انگریزی حکومت میں جج کے عہدے پر فائز تھے، اس لیے راست لب ولہجہ میں انگریزوں کے ظلم وزیادتی کے خلاف آواز بلند کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ شاید اسی لیے انہوں نے اپنے ہم عصروں میں سب سے الگ راہ نکالی اور وہ راہ طنز لطیف کی تھی، جس پر گامزن ہو کر وہ قومی، وطنی، تہذیبی اور سماجی مسائل کے باریک سے باریک پہلوؤں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتے رہے۔ ان کے اس رویے نے انہیں ایک منفرد اور اہم مقام دلا دیا۔ سرکاری ملازمت کا خیال رکھنا ضروری تھا لیکن نئی تہذیب کا جو سیلاب زوروں پر تھا، اسے روکنا بھی ان کے لیے قومی فریضے جیسا تھا۔ اس لیے جو کچھ کہا ظرافت کے پیرائے میں کہا۔ اس طرح ہنسی ہنسی میں دل کی بات کہہ کر اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔

"شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف"

اس طرح اکبر جج ہونے کے باوجود "اودھ پنچ" میں ظرافت کے پیرائے میں وہ سب کچھ کہہ گئے جو سیاسی لیڈر اپنی تقریروں میں کہہ رہے تھے۔ "اودھ پنچ" اردو کا وہ اہم رسالہ ہے، جس نے طنز و مزاح کے پیرائے کو اپنا کر اردو کو ایک ایسا اسلوب دیا، جس میں طنز، مزاح، تلخی اور شوخی بنیادی حیثیت کے حامل تھے۔ اس رسالے نے اپنی تیکھی اور طنز و مزاح میں ڈوبی ہوئی تحریروں کے ذریعے ملک کے تہذیبی اقدار کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے روکنے کی کوشش کی ہے۔ "اودھ پنچ" کے قلم کاروں اور سر

سید کے مخالفین کے گروپ میں سے اکبر سب سے زیادہ ذہین اور تیز ہی نہ تھے بلکہ بہتر اور قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ اودھ پنچ کے اہم قلم کار کی حیثیت سے انہوں نے اس دور کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔

اکبر ایک بڑا شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مفکر کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس زمانے میں پوری قوم افراط وتفریط کی شکار اور منزل کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔ اکبر کے پاس قوم کا ایک واضح اور حقیقت پسندانہ تصور تھا۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

ہے قوم جسم سلطنت اُس میں ہے مثلِ روح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے

(کلیاتِ اکبر (مکمل)، سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی، نارنگ ساقی (مرتب و مدون) میڈیا انٹرنیشنل، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص۔۴۷)

اکبر کی شاعری میں موجود وطنی اور قومی جذبے کا جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ انگریزوں کے زبردستی کے قبضے اور ہندوستانی تہذیب پر ان کے تسلط کے ہمیشہ شاکی رہے۔ سرکاری ملازمت نے ان کے اظہار کی راہ میں روڑے ضرور اٹکائے لیکن وہ دل سے آزادیِ وطن اور قومی تحریک کے قائل تھے۔ گاندھی جی کے لیے وہ کہتے ہیں:

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

اکبر نے اپنی شاعری میں قومی اتحاد پر بار بار زور دیا ہے اور ایسے پہلوؤں کی مذمت کی جو باہمی نفاق کا سبب بن کر قومی اور ملکی اتحاد کو پراگندہ کر رہے تھے۔ اکبر اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ چاہے ہمارے مذہب مختلف ہوں، ہمارا رہن سہن الگ ہو، چاہے ہماری زبانیں الگ ہوں لیکن ہم ہندوستانی ہیں اور ایک قوم ہے۔ مثالیں دیکھیں:

تم ملویا نہ ملو مجھ سے مَنو یا نہ مَنو
ساتھ رہنا ہے اسی ملک میں اے ہم وطنو

ایضاً، ص۔۴۴۳

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو
کہتا ہوں میں ہندو مسلمان سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر تو پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

ایضاً، ص۔۱۵۷

قومی اتحاد اور آزادیِ وطن کی تمنا جو اکبر اپنے دل میں رکھتے تھے، اس کے پس پردہ ان کا وہ جذبہ تھا، جس کے تحت وہ ہندوستان کو انگریزوں سے نجات دلانے کے لیے ہندوستانی قوم تک یہ پیغام پہنچانا چاہتے تھے کہ غلام قومیں دنیا میں اپنا وقار کھو دیتی ہیں۔ اسی کے ساتھ اکبر اس کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ ذلت کی غلامی کسی طرح قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے بیدار رہو اور اپنے آپ کو سمجھنے کا قصد کرو۔

حضور عرض کروں میں جو ناگوار نہ ہو
وہ یہ کہ موت ہی بہتر ہے جب وقار نہ ہو

اکبر یہ سمجھتے تھے کہ ہم کو آزادی اسی وقت مل سکتی ہے اور گاندھی جی اور دوسرے آزادی پسند رہنماؤں کی تحریکیں اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہیں، جب ہندوستان کے لوگ اپنے آپس کے اختلافات کو ختم کر دیں اور مل کر اس کی جدوجہد کریں کیوں کہ انگریزوں کا یہ معمول رہا ہے کہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو''۔ اس لیے اکبر کہتے ہیں۔

حالات مختلف ہیں ذرا سوچ لو یہ بات
دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑ مرو

ایضاً،ص۔۶۱۲

اسی لیے وہ ہندوستانیوں کو "مَیں،مَیں" کرنے کے بجائے "ہم" بننے کی ہدایت دیتے ہیں۔

تفرقوں کے یہ جو طوفان ہیں بپا کچھ کم تو ہوں
ہم کو کرنا چاہیے سب کچھ مگر ہم ہم تو ہوں

ایضاً،ص۔۴۲۹

مغربی تہذیب واقدار کی اندھا دھند تقلید کا اندیشہ ہمیشہ انہیں ستاتا رہتا تھا۔شاید ان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ مغرب کی چمک دمک ہندوستانی قوم کو اس کی شاندار تہذیب سے دور کر دے گی۔مغربی تہذیب کے آنے والے اس سیلاب سے اکبر بیزار تھے۔یہ نہیں ہے کہ وہ جدید تعلیم کے خلاف تھے۔خود اپنے صاحبزادے عشرت حسین کو انہوں نے جدید اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیجا تھا اور جب انہیں محسوس ہوا کہ لندن اور مغرب کی فضا نے عشرت کو اسیر کر لیا ہے تو ان کے لیے یہ پیغام بھیجا کہ:

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے
بخل ہے اہلِ وطن سے جو وفا میں تم کو
کیا بزرگوں کی وہ سب جود و عطا بھول گئے
نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں
اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے

ایضاً،ص۔۲۱۳

ان کے نزدیک وطن اور وطن کے تہذیبی اقدار کی بڑی اہمیت تھی۔انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ان کے عہد کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔پرانے اقدار رفتہ رفتہ مردہ ہوتے جا رہے ہیں لیکن اس احساس کے باوجود وہ بدلتے حالات سے نہ تو مصالحت کر سکے اور نہ ہی انہیں پوری طرح قبول کرنے پر آمادہ ہو سکے۔وہ مغربی تعلیم کے اُس خطرناک پہلو سے قوم کو بچانا چاہتے تھے،جس سے ہندوستانیوں کی شناخت ختم ہو سکتی تھی۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بے گانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

ایضاً،ص۔۴۸۹

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ایضاً،ص۔۲۵۷

ان کے خیال میں مغرب کی اندھی تقلید باعث ہلاکت ہے۔ملک تو ہاتھوں سے نکل ہی چکا اب دین و مذہب پر بھی مغرب کے حملے ہیں۔اگر ذہن و دماغ پر بھی مغرب کا اثر ہو گیا اور اگر روح غلام ہو گئی تو پھر ہندوستانیوں کی قسمت میں غلامی ہی غلامی ہے۔بشرطیکہ ہم اپنی اصلیت کو پہچان سکیں اور اپنی جڑ سے علاحدگی اختیار نہ کریں۔

اکبر کے نزدیک قومیت کا کوئی سطحی تصور نہیں تھا۔ان کے نزدیک اس کی جڑیں مذہبی عقائد اور تہذیبی روایات سے جڑی ہوئی ہیں۔مغربیت ان جڑوں کو کھودنے اور انہیں ختم کرنے کے در پے ہے۔اس لیے ان کی شاعری کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستانی لوگوں کو ان کے مذہب،ان کی تہذیب اور ان کے ملک کی عظمت کا احساس دلائیں اور اس طرح اس مہم کو ناکام بنائیں جو انگریز ہندوستانیوں کو خود ان کی نظروں سے گرانے کی کوشش کر رہے

تھے۔ اکبر نے قوم وملت کے اس الم انگیز سانحے کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور مغرب کے بالمقابل سینہ سپر ہوکر اپنے ہم وطنوں کی اصلاح کرنے لگے۔

اک برگ ِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا
موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمہیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

ایضاً ص۔۳۵۲

اکبر ترقی کے خلاف نہیں تھے۔ ترقی ضرور ہو لیکن اس خیال کے مطابق نہیں کہ نئی چیزیں اچھی ہیں اور پرانی خراب ہیں۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد فرماتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ اکبر ایک تہذیب، ایک تمدن کے عاشق ہیں۔ وہ قدامت پرست ہیں اور نئی تہذیب، نئی تعلیم، نئے خیالات اور نئے اخلاق کے مخالف ہیں۔ ان کا خیال درست ہو یا نادرست، لیکن وہ نئی تہذیب کی ترویج میں تخریب کے آثار پاتے ہیں۔۔۔''

(کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ دوم)، دی آزاد پریس، سبزی باغ، پٹنہ، ۱۹۶۶ء، ص۔۷۹)

آگے لکھتے ہیں کہ:

''وہ ترقی کے خلاف نہ تھے۔ ترقی کی طرف قدم اُٹھے اور ضرور اُٹھے لیکن ذرا سوچ سمجھ کر۔ نئی چیزیں اچھی ہیں، پرانی چیزیں بُری ہیں، یہی نقطۂ نظر عام ہو چلا تھا۔ وہ اس بے عقلی کے مخالف ہیں۔ ترقی کے خواہاں ہیں اور جدید قومیت کی تعمیر سے ہراساں نہیں۔''

(کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ دوم)، دی آزاد پریس، سبزی باغ، پٹنہ، ۱۹۶۶ء، ص۔۸۵)

اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ماڈی اور سائنسی تعلیم اور ترقیوں کے مخالف نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ وطن کے نوجوانوں کو صاف لفظوں میں تلقین کرتے ہیں کہ:

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور، سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو علومِ بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانوں ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

(کلیاتِ اکبر (مکمل)، ایضاً ص۔۲۰۰-۲۰۱)

اکبر کو قدامت پسندوں میں شمار کیا جاتا رہا ہے لیکن اگر مندرجہ بالا اشعار کو دیکھا جائے تو کیا ان پر کسی بھی طرح روایت پسند، ماضی پرست، قدامت پسند اور رجعت پسند ہونے یا پھر نئی تعلیم یا سائنس اور ارتقا سے خوفزدہ ہونے کا الزام لگایا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے، نہیں! بلکہ غور سے دیکھیے تو اکبر ہی قوم کے مخصوص رجحانات کے معتبر نمائندے ہیں۔ اگر چہ یہ سرسید کے ایک حد تک ضرور مخالف تھے مگر سرسید کے کام کی اہمیت کو جانتے اور سمجھتے تھے۔ اس لیے تو سرسید کی وفات پر انہوں نے کہا تھا کہ:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ایضاً ص۔۲۰۳

نیز اس احساس کو کبھی مردہ نہیں ہونے دیا کہ سرسید کا ذہن حُبِ قومی اور جوشِ عمل سے خالی نہیں ہے۔ اسی لیے اکثر جگہوں پر ان کے عمل اور استقلال کی تعریف بھی کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

صدمے اٹھائے، رنج سہے، گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
دکھلا دیا زمانے کو زورِ دل و دماغ
بتلا دیا کرتے ہیں یوں کرنے والے کام

ایضاً، ص۔۱۸۸

واہ رے سیّد پاکیزہ گہر کیا کہنا
یہ دماغ اور یہ حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں یہ سوزِ جگر کیا کہنا
ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

ایضاً، ص۔۲۲۹

اکبر تجارت کو باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اگر چہ وہ خود ملازم رہے لیکن ملازمت سے نالاں نظر آتے ہیں۔ شاید اسی لیے ۱۹۰۳ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر آزادیِ وطن کی تحریکوں میں شامل ہوگئے۔ اس وقت چونکہ وہ بڑی آسانی سے ہائی کورٹ جج بن سکتے تھے مگر بقول ان کے:

زمانے نے مرے آگے بھی دنیا پیش کر دی تھی
مگر میں نے تو اپنا فائدہ انکار میں دیکھا

ایضاً، ص۔۳۹۶

ایک سچے اور خالص قوم پرست شاعر کی حیثیت سے اکبر کی دور بینی اور گہری بصیرت ہر لحاظ سے قابلِ داد ہے۔ انہیں اس حقیقت کا بخوبی علم تھا کہ کوئی بھی قوم محض سرکاری ملازمت یا نوکری کے سہارے دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی کیوں کہ وہ یہ دیکھ چکے تھے کہ کس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئی اور پھر پورے ملک پر قابض ہوگئی۔ اسی لیے اکبر نے جہاں بے شمار شعر سرکاری ملازمت کی مخالفت میں کہے اور اس کا مذاق اڑایا وہیں تجارت اور صنعت و حرفت کی پرزور وکالت بھی کی۔

پاتی ہیں قومیں تجارت سے عروج
بس یہی ان کے لیے معراج ہے
ہے تجارت واقعی اک سلطنت
ناز یورپ کو اسی کا آج ہے
لفظ تاجر خود ہے اے اکبر ثبوت
دیکھ لو تاجر کے سر پر تاج ہے

ایضاً، ص۔۱۶۹-۱۹۷

کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ
آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک

ایضاً، ص۔۳۸

زوال قوم کی تو ابتدا وہی تھی کہ جب
تجارت آپ نے کی ترک نوکری کر لی

ایضاً، ص۔۳۰۳

قومی معاشرے کے زوال کو جس خلوص و دردمندی کے ساتھ اکبر نے موضوع بنایا ہے، شاید دوسروں کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ اکبر کی قومیت پسندی اور مشرقیت تھی، جس کے زیرِ اثر انہوں نے آدابِ مغرب، مغربی تہذیب و تمدن، مغربی طرزِ حکومت، مادیت پرستی، ہندوستانیوں کی حق تلفی، ان کے استحصال اور ان کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک اور غیر

متصوفانہ رویہ پر کڑی نکتہ چینیاں کی ہیں اور اپنے شاعرانہ من کو قومی معاشرے کے وقار کی حصولیابی کے لیے وقف کر دیا۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا کہوں اس کو میں بدبختی نیشن کے سوا
اس کو آتا نہیں اب کچھ ایجیٹیشن کے سوا

ایضاً، ص۔۲۳۰

یہ بات غلط کہ ملک اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند
یہ ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش
یورپ کے لیے بس ایک گودام ہے ہند

ایضاً، ص۔۲۳۲

کبھی کبھی نامناسب یا جانب دارانہ انداز میں ان پر اس لیے انگلی اٹھائی گئی کیوں کہ ان کے بہت سے نظریات اور کانگریس پارٹی کے موقف، کردار اور نصب العین میں کافی مماثلت تھی اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے دل میں مہاتما گاندھی کے لیے بہت عزت تھی اور انہیں یقین تھا کہ گاندھی جی کی زندگی کا مقصد سچائی، عدم تشدد اور بلا تفریق کے خدمتِ خلق کرنا ہے اور وہ سارے ہندوستانیوں کو ایک قوم اور ایک برادری مانتے تھے۔ اسی لیے گاندھی جی کی فکر کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

بجھی جاتی ہے شمعِ مشرقی، مغرب کی آندھی سے
امید روشنی قائم ہے لیکن بھائی گاندھی سے

ایضاً، ص۔۶۶۶

ایسے لیڈر جنھوں نے اپنے فائدے کے لیے قوم کا نعرہ لگایا، ان کے لیے اکبر کے شعر ایک نشتر کی طرح ہیں:

گردن ریفارمر کی اک سمت تن گئی
بگڑی ہو قوم و ملک کی ان کی تو بن گئی

ایضاً، ص۔۲۱۰

تمام قوم اڈیٹر بنی ہے یا لیڈر
سبب یہ ہے کہ کوئی اور ڈگی نہ رہی

ایضاً، ص۔۳۶۱

اکبر کے خیال میں انگریزی حکومت کی کونسلیں، اسمبلیاں، ووٹ بازیاں اور الیکشن کی لڑائیاں ہماری قومی ترقی اور وطن کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ کی علامت بلکہ زنجیر غلامی کے مزید حلقے اور ہمارے حق میں مزید پھندے ہیں:

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا
اچھے اچھے ووٹ کے شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ
اس کو سمجھیں فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی
سلف گورنمنٹ آگے آئی

ایضاً، ص۔۵۲۸

اکبر نے اپنی زندگی کے آخری دور میں بھی، جب وہ دنیا سے الگ ہو کر تصوفانہ زندگی گزار رہے تھے، ہندوستانیوں کو مادیت پرستی کی بے مقصد عیش پسندی سے گریز کرنے کی جانب متوجہ کیا۔ انہیں اپنے ہم وطنوں کی روحانی بے چینی کا احساس ستاتا رہتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے کہا:

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا

ایضاً، ص۔۲۴

ہم کلام اکبرالہ آبادی کے مطالعے سے جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ قومی دردمندی اور ملی فلاح و بہبود کی جو جذباتی تڑپ ان کے دل میں موجود تھی، اس میں کسی قسم کا کوئی تصنع نہیں تھا۔ اکبر، تہذیبی محکومی کو سیاسی محکومی سے زیادہ خطرناک تصور کرتے ہیں کیوں کہ اس سے قومی انفرادیت اور وقار کے مجروح و منہدم ہونے کا زیادہ خدشہ ہے۔ ان کی شاعری بظاہر تو بڑی آسان اور سادہ معلوم ہوتی ہے مگر ان کا شعری عمل خاصا پیچیدہ اور تہہ دار ہے۔ اکبر، آزادیِ وطن کے قائل تھے اور مغربی تہذیب کی بڑھتی ہوئی تہذیبی یلغار کے مخالف۔ اکبر، اقبال کی طرح ایک پیامی شاعر تھے اور ان کا یہ پیغام تھا کہ جدید یا مغربی تہذیب کے طوفان سے بچو اور اپنی تہذیب سے رشتہ استوار کرو۔ اکبر نے اپنے کلام سے ایک ایسی قوم کو جو محض بابوگیری کے چکر میں بے غیرتی کا لبادہ اوڑھے جا رہی تھی، غلاظت کے دلدل سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں وہ ہندوستانی قوم و ملت کو بیدار اور ہوشیار رکھنا چاہتے تھے اور انہیں آنکھیں کھول کر معاشرے کا پوری طرح جائزہ لینے کا مشورہ دے رہے تھے۔ وہ مشرقی تہذیب اور ثقافتی اقدار کے علمبردار تھے۔ انہیں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ ان کے ہم وطن انگریزوں کی تقلید میں خود انگریز بن جانے کی کوشش کرنے کے بجائے ان راستوں پر چلیں جن پر گامزن ہو کر اقوام عالم نے ترقی کی منزلیں سر کی ہیں۔ ان کے یہاں جابجا ایسی آفاقی صداقتیں بکھری ہوئی ہیں جو اکبرالہ آبادی کو ہر دور میں زندہ رکھیں گی۔ ہاں انہیں سمجھنے اور پرکھنے کے زاویے بدلتے رہیں گے۔

کتابیات

۱۔ اکبرالہ آبادی: اپنے کلام کی روشنی میں، پنڈت پدم کانت مالویہ، اکبر میموریل کمیٹی، ۴۲ چوک الہ آباد۔

۲۔ اکبرالہ آبادی: ایک سماجی و سیاسی مطالعہ، افصح ظفر، ڈاکٹر، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۱ء

۳۔ اکبرالہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

۴۔ کلیاتِ اکبر (مکمل)، سید اکبر حسین اکبرالہ آبادی، نارنگ ساقی (مرتب و مدون)، میڈیا انٹرنیشنل، دہلی، ۱۹۹۸ء

۵۔ اکبرالہ آبادی، صغرا مہدی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

۶۔ اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں، عبدالماجد دریابادی، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء

۷۔ اکبرالہ آبادی: نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار، شمس الرحمٰن فاروقی، جواہر لعل نہرو مارگ، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء

۸۔ فکر و تحقیق (سہ ماہی)، اکبرالہ آبادی نمبر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۹ء

☆☆☆

اکبرالہ آبادی مشرقی تہذیب وروایت کا امین
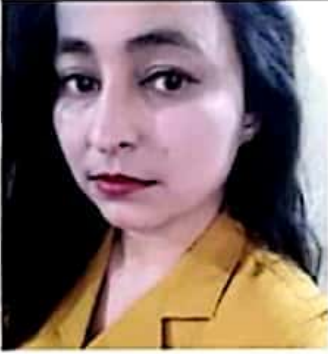
شاہجہاں

شاہجہاں، مئو آئمہ، الہ آباد کی رہنے والی ہیں۔ آپ دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔

Email : shahjahan96216@gmail.com / Mob : +91 9621676065

اکبر کی شاعری 55 سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ اکبر نے جس مقصد کے تحت شاعری کی تھی وہ یہ تھا کہ انسانیت کو ایک ایسی راہ دکھائی جائے جو تمام فلاحی نقطہ ہائے نظر اور فلسفوں سے جداگانہ ہو جو مشرقی اقدار اور روایات کا امین ہو۔ اکبر نے مقصدی شاعری میں طنز و ظرافت کے ذریعہ سارے رول ادا کیا ہے۔ اکبر نے عامی شاعری کو کبھی پسند نہیں کیا بلکہ خود ایک الگ راہ نکالی۔ اس طرح اکبر نے شاعری کے جسم میں نئی روح پھونکی ۔ قافیہ آرائی ان کا مخصوص انداز ہے۔ اکبر اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے نت نئے سلیس قوافی ڈھونڈ لاتے ہیں۔ ایسا وہ الفاظ پر غیر معمولی قدرت حاصل ہونے کے سبب کر تے تھے۔ انہوں نے انگریزی کے الفاظ سے بھی اپنے قافیوں میں مدد لی اور ان سے الگ لطف انبساط پیدا کیا۔

اکبرالہ آبادی کا نام آتے ہی طنز ومزاحیہ شاعری ذہن میں آتی ہے لیکن اس طرز کی شاعری کے نمونے ہمیں اکبرالہ آبادی سے قبل بھی ملتے ہیں۔ جعفر زٹلی اور مرزا محمد رفیع سودا کے یہاں طنز و مزاح کی شاعری ایک دیگر شکل میں ملتی ہے ۔ سودا کے 'شہر آشوب' اور قصیدہ 'تضحیک روزگار' میں طنز وظرافت کی یہ نوعیت دیکھی جا سکتی ہے جن میں سیاست و معاشرت کی ناہمواریوں اور افراد کی خامیوں پر طنز و مزاح کے ذریعہ کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ ان شعرا کے یہاں طنز و مزاح کا انداز اور اسلوب مختلف ہے۔ مگر طنز و مزاح کی شاعری کا آغاز بعد میں ہوتا ہے جس میں اکبرالہ آبادی سرفہرست ہیں۔

ظرافت کے اعلیٰ، منفرد نقوش ہمیں اکبرالہ آبادی کے یہاں نظر آتے ہیں۔ اکبر نے طنز ومزاحیہ شاعری کے میدان میں جو معیار قائم کیا وہ اس کی تقلید کئی شعرا یہاں تک کہ عہد حاضر کے شعرا کے یہاں نظر آتی ہے۔ اکبر کے فن کا ایک خاص اسلوب، آہنگ اور انداز ہے اور وہ فنی تقاضوں، لوازمات کو پورا کرتا ہے۔ اکبر کا عہد قدیم و جدید تہذیب کے تصادم اور کشمکش کا عہد تھا۔ مغرب پرستی، مغربی افکار و خیالات سے اثر پذیری، یہاں تک کہ عادات واطوار، تعلیم وتہذیب اور زبان پر مغرب کا اثر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اکبر مغرب کی اس کورانہ تقلید کو طنز و مزاح کی ڈھال سے روکنا چاہتے تھے۔ وہ مشرقی روایات کے دلدادہ تھے۔ انھیں مشرقی تہذیب و تمدن کی اہمیت وافادیت کا احساس تھا اور وہ اس کے زوال کو دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا انھوں نے مغرب پرستی کے خلاف علم بلند کیا اور اپنے کلام کے ذریعے مشرقی تہذیب کی خوبیوں کو نمایاں کر مغربی تہذیب کی

خامیوں کو اجاگر کر رہے تھے۔ اکبر ایک مقصد کے تحت پُرخلوص انداز میں اپنے فن کے ذریعہ اظہار خیال کر رہے تھے۔ اکبر کے طنز و مزاح میں درد مندی کا عنصر ہے جس سے شاعری میں سنجیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔

اکبر کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے قاری عجیب کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ زمانی اعتبار سے ان کی شاعری انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول پر محیط ہے۔ یہ زمانہ اردو میں نئے ادب و نظریات کی ترویج و اشاعت کا زمانہ تھا۔ قومی سطح پر اپنے وجود کے احساس اور غلامی کے خلاف صف آرا ہونے کی کوشش نے ہمارے ادب کو نت نئے اسالیب و موضوعات سے روشناس کیا۔ مقصدی ادب کے ابتدائی نمونے بھی اسی دور کی یادگار ہیں جس میں اکبر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو بھی رکھا جا سکتا ہے۔ ادبی اور فنی اعتبار سے اکبر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری خاص اہمیت کی حامل ہے۔

اکبر کی شاعری تہذیبوں کے باہم ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کی عکاس ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی زوال، رہنمایانِ قوم کے قول و عمل میں تضاد، واعظ اور شیخ و برہمن کی عیاریوں، سیاست کی ریشہ دوانیوں، سماج کی بے راہ روی، ریاکاری و مکاری، لسانی تعصبات وغیرہ اکبر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے موضوعات ہیں۔ فنی اعتبار سے اکبر کی شاعری کو اکثر ناقدین نے بذلہ سنجی (WIT) کی شاعری کہا ہے۔ کیوں کہ اکثر و بیشتر مواقع پر انھوں نے تمثیل اور معنی آفرینی کے بجائے صرف رعایت لفظی اور الٹ پھیر سے مزاح پیدا کیا ہے۔ حالانکہ ان کی شاعری میں تخیل اور معنی آفرینی سے خالی نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں اس طرح کے ادبی عناصر کی فراوانی ہے اور اس نمونے بھی بہ کثرت مل جاتے ہیں۔ مگر بذلہ سنجی یا لفظی شعبدہ بازی سے مزاح پیدا کرنے کی صلاحیت کم ہی شعرا میں نظر آتی ہے۔ بذلہ سنجی یا لفظی بازی گری سے پیدا ہونے والے مزاح کے سلسلے میں یہ بات واضح رہے کہ اس میں عام طور پر الفاظ کے بگاڑ، رعایتِ لفظی، تضمین، تصرف، محاورہ اور دوسری لفظی شعبدہ بازیوں سے کام لے کر مزاح کے پہلو نکالے جاتے ہیں اسے ہی بذلہ سنجی (WIT) سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اکبر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری انہیں خصوصیات سے متاصف ہے۔ لہٰذا ان کے طنز و مزاحیہ اسلوب میں تضمین، لطیفہ گوئی، لفظی شعبدہ بازی، الفاظ کے الٹ پھیر، علامت و استعارہ، تقابل و تضاد، صنائع لفظی و معنوی وغیرہ جیسے فنی لوازمات کی کارفرمائی دیکھ سکتے ہیں۔ بعد کے ادوار میں اکبر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا تتبع متعدد شعرا نے کیا ہے۔

علامہ اقبال نے اکبر کے تتبع میں ظریفانہ شاعری کی۔ ''بانگِ درا'' میں شامل طنزیہ و مزاحیہ قطعات کی زبان و بیان، لب و لہجہ اور موضوعات اکبر سے مستعار تھے۔ اکبر اور اقبال دونوں کے یہاں فکر و فلسفہ ہے اور پیغام ہے۔ مشرقی تہذیب کے یہ دلدادہ، ذہنی اور فکری سطح پر نہ صرف ایک دوسرے کے قریب نظر آتے ہیں بلکہ اقبال اکبر کے اسلوب کی تقلید بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اکبر کے مشہور قطعہ ''بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں'' سے متاثر ہو کر اقبال نے لڑکیوں کی انگریزی زبان سے دلچسپی پر طنزیہ وار یوں کیا ہے:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مد نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

قطعہ کی زبان و بیان اور نقطۂ نظر اکبر کے انداز اسلوب سے مستعار ہے۔اس میں مستعمل تراکیب ولفظیات اور اصطلاحات کے برجستہ استعمال سے بھی واضح ہے کہ اکبر کا تتبع کیا گیا ہے۔لیکن چونکہ بنیادی طور پر اقبال کے یہاں ایک فلسفہ و پیغام ہے۔لہذا ظریفانہ طرز ان کے حسب حال نہیں ہے اورانہوں نے اس پر زیادہ لکھا بھی نہیں۔

اسی طرح اس دور کے اہم شاعر ظریف لکھنوی اور احمق پھپھوندوی وغیرہ کے یہاں بھی اکبر کا تتبع ہے۔ بذلہ سنجی، لفظی الٹ پھیر، رعایت لفظی اور مخصوص لب و لہجے کی ادائیگی سے طنز و مزاح پیدا کرنے کی کارفرمائی ہو یا انگریزی الفاظ، تحریف اور سیاسی موضوعات کو برتنے کا انداز یہ سب حربے اکبر نے طنز و مزاح کی غرض سے بکثرت استعمال کیا ہے ان میں تضمین نگاری اور پیروڈی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔اکبر کے بعد شعرا نے کثیر تعداد میں تضمین بطور حربہ طنز و مزاح استعمال کیا اوراس طرح روایت کو آگے بڑھایا ہے۔سید محمد جعفری، شہباز امروہوی، مجید لاہوری، شاد عارفی، رضا نقوی واہی، عاشق محمد غوری کے علاوہ متعدد شعرا نے تضمین کے ذریعے اپنے کلام کو جلا بخشی ہے۔

تحریف نگاری یا پیروڈی کے فن کے ذریعہ اساتذہ کے کلام میں لفظی الٹ پھیر سے ان کی معنوی کائنات تبدیل کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی نے بھی پیروڈی پر طبع آزمائی کی ہے۔حسرت موہانی کے ایک شعر کی پیروڈی ملاحظہ ہو:

ڈنر سے تم کو کم فرصت، یہاں فاقے سے کم خالی
چلو اب ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

اکبر کے بعد کے شعرا نے نہ صرف پیروڈی کو بطور صنفِ سخن اپنایا اور سیاسی و سماجی ابتری پر طنز کیا بلکہ لفظی پیروڈیوں کے ذریعے طنز و مزاح کے فن کو وسعت عطا کی۔ کنھیا لال کپور، شہباز امروہوی، دلاور فگار، مسٹر دہلوی، فرقت کاکوری، شوکت تھانوی، مجید لاہوری، ظریف جبل پوری، رضا نقوی واہی اور سلیمان خطیب وغیرہ نے اردو کے مشہور اشعار کی پیروڈیوں میں نت نئے تجربے کئے لیکن خالص لفظی پیروڈیوں کے ابتدائی نقوش کلیاتِ اکبر میں ہی موجود ہیں۔

تحریف نگاری کے علاوہ اکبر الہ آبادی کے کلام میں بعض انگریزی الفاظ ان کے نقطۂ نظر کے اظہار کے لئے 'علامت و استعارہ' کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جن کی وساطت سے وہ مغربی تہذیب و تمدن کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ ریل، انجن، ٹائپ، پائپ، پانیر، مسن، نیٹو جیسے الفاظ اکبر کے فن کی شناخت ہیں۔ان الفاظ کا استعمال وہ زبان پر حاکمانہ قدرت کے سبب کر سکے ہیں۔ ٹائپ اور پائپ، گزٹ، نیشن، امی ٹیشن، ڈارون، کالج، اسپیچ، لیمپ، پریڈ، تھیٹر، گاون، کمیشن غرض متعدد انگریزی الفاظ ہیں جو اکبر الہ آبادی کی شاعری میں کہیں مزاح پیدا کرتے ہیں تو کہیں طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔

اکبر کے کلام کی ایک بڑی خوبی ان کی زبان و بیان پر قدرت اور صنائع لفظی و معنوی پر ان کی مضبوط گرفت نیز نادر قوافی کا استعمال بھی ہے۔ انھوں نے لوازمِ شعری میں قابل قدر اضافے بھی کیے ہیں اور صنعتوں کے استعمال سے اپنی شاعری کو وسعت دی ہے۔ان کے ذریعہ مستعمل نت نئے قوافی لفظ و معنی کی فضا سازی اور ناہموار زمینوں میں راستے بنا دیتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہوتے ہیں۔ یہاں اکبر کے کلام سے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں جن میں انھوں نے زبان و بیان کی ندرتوں کو بروئے کار لا کر طنز و مزاح کے گل کھلائے ہیں:

کہاں کے مسلم کہاں کے ہندو بھلائی ہیں سب نے اگلی رسمیں
عقیدے سب کے ہیں تین تیرہ، گیارھویں ہے نہ اشٹمی ہے

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ
گھر میں بیٹھے ہوئے واتّین پڑھا کرتے ہیں

انوکھے ہیں مشاغل حضرتِ اکبر کے ان روزوں
الم تر کیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں لیل خانے میں

ہم ریش دکھاتے ہیں کہ اسلام کو دیکھو
مس زلف دکھاتی ہے کہ اس لام کو دیکھو

اکبر کی شاعری کے یہ نمونے طنز و مزاح عمدہ نمونے ہیں۔ان میں رعایتِ لفظی، صنائع لفظی و معنوی، ردیف وقوافی کی ندرت کے ساتھ لفظ و معنی کے باہمی رشتوں کو بھی نہایت فنکارانہ انداز میں نبھایا گیا ہے۔ان اشعار کے سرسری مطالعے سے ہی اکبر کی زبان پر قدرت اور فنِ شاعری پر ان کی دسترس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔اس میدان میں اکبر کا کوئی ثانی نہیں ہے۔طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی مروجہ ہیئتوں کا تتبع اکثر شعرا نے کیا ہے۔اکبر نے قطعہ کو طنز و مزاح کا ایک جانا پہچانا ہتھیار بنا دیا۔لہٰذا اکبر کے بعد آنے والے شعرا کے یہاں ہمیں قطعہ کی اس ہیئت کی پابندی نظر آتی ہے اور اکثر طنزیہ و مزاحیہ شعرا اس ہیئت میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

غزل میں بھی طنز و مزاح کی روایت رہی ہے۔اکبر نے اپنی شاعری کے لئے غزل اور قطعات کا ہی انتخاب کیا۔ایجاز و اختصار، رمز و ایمائیت، استعاراتی اندازِ بیان اور مجازی معنوں پر انحصار کی وجہ سے غزل طنز و مزاح کے فن کو جلا ملتی ہے۔اکبر کی ایسی غزلیں فن کے نقطہ عروج پر نظر آتی ہیں۔غزل کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی آمیزش نے اکبر کی غزل کو شعرائے طنز و مزاح کے لیے مشعلِ راہ بنا دیا اور مزاحیہ غزل گوئی کی ایک مستحکم روایت قائم ہوگئی۔

اکبر نے جن موضوعات پر طبع آزمائی کی وہ ان کے عہد سے متعلق تو ہیں مگر اکبر کی خلاقانہ صلاحیت نے ان موضوعات کو آفاقی بنا دیا ہے۔ان کے الفاظ کے مخصوص استعاراتی و علامتی پیرائے اظہار نے انہیں ایک طرح کی جاودانی عطا کر دی ہے۔بعد کے شعرا نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے میدان میں اکبر کے انھی موضوعات ولفظیات کو جدید پس منظر میں پیش کیا ہے۔لہٰذا شرق و غرب کی تہذیبی آمیزش، مشرقی تہذیب کی روایت، حکومت وقت کی خامیوں، سیاست کا کھوکھلا پن، استحصال، لیڈرانِ قوم کے قول وعمل کے تضادات اور اپنی تہذیب سے دلی وابستگی کے موضوعات آج بھی طنز و مزاح کی شاعری میں عام ہیں اور اس کے پس منظر میں ہمیں اکبر کی ہی آواز سنائی دے رہی ہے۔

اکبر کی ایک بڑی انفرادیت یہ بھی کہ غیر مانوس الفاظ کو اس انداز سے برتتے ہیں کہ وہ بلاغت کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے مثلاً ٹٹو، بدھو اور نیٹو جیسے الفاظ جو کانوں کو کراہت محسوس کراتے ہیں اکبر انہیں فن کارانہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اس میں ایک جہان معنی درآتی ہے اس کا اندازا کیجئے۔

ٹٹو پہ جس طرح سے ہوتا زی کا سازبوجھ
یوں بابوان ہند پہ ہے اب نماز بوجھ

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں
ینگ بدھو وارث اسلام ہیں

اکبر کا کلام اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے شعرا و ادبا کا خوب خوب مطالعہ کیا، ان کی تخلیقی نگارشات پہ غور کیا، ان کے مافی الضمیر اور ان فکر و فن کو اچھے سے سمجھا ہے تب کہیں جا کر بحر شاعری میں غوطہ زن ہوئے۔خود اکبر کو اپنی شاعری پر زعم ہے۔

محل شکر ہیں یہ درفشاں نظمیں
ہر اک زباں کو یہ موتی نہیں عطا ہوتے

اکبر کی طبیعت میں طنز وظرافت کا سیلاب امنڈ پڑتا ہے۔ دراصل یہ ان کے خون جگر صرف کرنے کا نتیجہ ہے جو برسوں کے تجربہ و مشاہدہ اور عرق ریزی کا نتیجہ تھا۔خود اعتراف کرتے ہیں۔

شعر اکبر میں کوئی کشف وکرامات نہیں
دل پہ گزری نہ ہو جوایسی کوئی بات نہیں

غالب کے بعد اکبر طنز وظرافت کے میدان میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔اکبر کی طنزیہ شاعری نے ارباب علم وفن کی محفلوں کو قہقہہ زار بنایا اور ظرافت کے پردے میں سنجیدگی ومتانت سے لوگوں کو غور وفکر کی بھی دعوت دی۔ طنز اور ظرافت ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں ظرافت میں طنز ضرور نمایاں ہوتا ہے۔اکبر کی ظریفانہ شاعری ایسے ہی طنز سے معمور ہے۔اکبر جانتے ہیں کہ لوگ ضرب شدید گوارا کر لیتے ہیں لیکن طنز کا ایک ہلکا نشتر برداشت نہیں کر سکتے اس لئے وہ طنز کو ظرافت کا پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔اکبر نے طنز وظرافت کے لئے سبھی شعری لوازمات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی اور ایسی تشبیہات، الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا جو شاعری وفن میں ان کی تبحر علمی اور خلاقانہ ذہنیت کی دلیل ہے۔

اکبر نے ایسے عہد میں زندگی بسر کی جہاں لوگ مغرب کی کورانہ تقلید کو ترقی کا معیار سمجھتے تھے۔اکبر کا دل یہ سب دیکھ کر کڑھتا تھا۔لہٰذا وہ اندھی تقلید کے خاتمے کے لئے کمر بستہ ہوئے اور انہوں نے طنز و ظرافت کا سہارے کورانہ تقلید کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔لوگوں نے اکبر کی تضحیک پر قہقہہ لگایا لیکن اکبر کے طنز میں پوشیدہ تنقید واصلاح نے عوام کو احساس دلایا کہ ترقی مغرب کی چکا چوند میں اتنا اندھا نہیں ہونا ہے کہ انسان شعور وآگہی کو کھو بیٹھے۔اکبر ایک دوراندیش شخص تھے۔تغیر زمانہ سے لوگوں کو نئے انداز سے راستے پر لانے کے خواہش مند تھے اور اس کام کے لیے غزل یا تلخ نصیحت کی فرسودگی اور روایتی انداز سے اکبر آشنا تھے لہٰذا انہوں نے شاعری وہ طرز ایجاد کی جو ظاہری طور پر ظرافت و تمسخر مگر باطنی طور پر نصیحت وتنقید تھی۔

اکبر سرسید اور علی گڑھ تحریک کے خلاف تھے جوان کے خیال میں مغربی تہذیب کو سب کچھ سمجھ رہی تھی۔وہ مغرب کی اس تعلیم جدید سے خائف تھے جس سے روحانیت اور اخلاقیات کا درس نہیں ملتا بلکہ اس کی جگہ اخلاقی بحران، ذہنی غلامی، مادیت پرستی اور مذہب بیزاری جنم لیتی ہیں۔اکبر کے خیال میں چونکہ اخلاقی فساد میں کالج کی تعلیمات کا اہم رول ہے لہٰذا وہ کالج کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔اکبر ایسے فلسفے کا تمسخر اڑاتے ہیں جس سے عقل پر موٹا پردہ پڑ جاتا ہے۔ان کے خیال میں مغرب، مشرق کا بدترین اور عیار دشمن ہے جو اپنے دلکش فریب سے قدیم تہذیبوں کو نگلنا چاہتا ہے۔تہذیب سے متعلق ذہنوں میں جاری یہ ایک خاموش جنگ ہے، مشرقی عقل وشعور جس کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ان کے خیال میں تعلیم نسواں بھی اخلاقی بگاڑ کی بنیاد ہے۔

اکبر اس ترقی کے سخت مخالف ہیں جس کے سامنے انسان خدا اور اس کی عظمت فراموش کر بیٹھتا ہے۔اکبر مشرق ومغرب کے تصادم پر بھی تنقید کرتے ہیں۔اس تعلق سے اکبر کا ایک نظریہ ہے ان کی خواہش ہے کہ توحید سے کسی طور سمجھوتہ نہ کیا جائے لہٰذا وہ طرز مغربی ہی نہیں بلکہ اس کی تمام تر فکریات پر طنز وظرافت کا نشتر چلاتے ہیں۔اس تعلق سے اگر اکبر کے زاویہ نگاہ کا جائزہ لیا جائے تو اکبر حق بجانب نظر آتے ہیں

کیونکہ مغرب کا فلسفہ زندگی ایسے نظریات پر قائم ہے جہاں دین و مذہب اور عقائد کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ دیکھیے اکبر مشرق و مغرب کے تصادم کا فلسفہ کس طرح پیش کرتے ہیں۔

الجھا زلف مغرب میں دکھاتی ہے وہ دنیا
مگر دینی مقاصد میں ہزاروں پیچ پڑتے ہیں
ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش
بادہ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشہ تقویٰ کو کرو پاش پاش
بہت مشکل ہے نبھنا مشرق و مغرب کا یارانہ
ادھر صورت فقیرانہ ادھر سامان شاہانہ

اکبر طرز مغربی کو نئی تہذیب، نئی روشنی اور نئے طریقے سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اس تہذیب کے خمیر میں مادیت ہے لہٰذا انسان کا انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ اکبر کا اخذ کیا گیا نتیجہ آج بھی سچ ہے، صارفیت و مادیت مغربی تہذیب کے عناصر ہیں۔ چونکہ اس تہذیب کی خیرہ کر دینے والی ظاہری چمک نے سب کو فریب دیا ہے لہٰذا لوگ اس حقیقت کو دیکھ نہیں پاتے ہیں۔ اب نئی تہذیب و روشنی پر اکبر یوں طنز کے تیر چلاتے ہیں۔

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت پر
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

نئی تہذیب کی مخالفت کرتے کرتے اکبر کالج اور یونیورسٹی کو بھی نشانہ بناتے ہیں اور اس کے محض منفی پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ اس دوران چونکہ سرسید جدید تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں کوشاں تھے اس لئے اکبر سرسید اور علی گڑھ کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر کی طنز و ظرافت کے پہلو میں اصلاح و تنقید کا جذبہ مضمر ہے۔

سنتا نہیں کسی سے کچھ بڑھ بڑھ کے سوا
کہتا نہیں کوئی کچھ پڑھ پڑھ کے سوا
پڑھنے کا نہ ٹھیک اصول بڑھنے کی نہ راہ
اور قبلہ کوئی نہیں علی گڑھ کے سوا
ایمان بیچنے پہ سب ہیں تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے
طفل دل محو طلسم رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آگئی مذہب کو فالج ہو گیا
ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولویو
کس کو سونپیں تمہیں اللہ نگہبان رہے
نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اکبر مغربی طرز تعلیم کو مخصوص پیرائے میں تنقید کا ہدف بناتے ہیں اور اس کے مضر اثرات کی جانب خاص و عام کو آگاہ کرتے ہیں۔ اس مقام پر اکبر کی ظرافت اور طنز نہ صرف قابل دید ہو جاتی ہے بلکہ اس سے معاشرے میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ جدید دانشوروں نے اکبر کے اس نقطہ نظر کی تنقید کی ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ اکبر جدید تعلیم کے مخالف

ہیں حالانکہ اس کے بغیر زندگی ساکت و جامد ہو جائے گی۔لیکن اکبر دراصل مغرب کورانہ تقلید کے مخالف تھے نہ کہ جدید تعلیم کے۔اکبر بذات خود جدید تعلیم سے آراستہ و پیراستہ تھے۔جدید تعلیم کے متعلق اکبر کا نقطہ نظر مندرجہ ذیل اشعار سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس اک سخن بندہ عاجز کی رہے یاد
اللہ کو اور اس کی حقیقت کو نہ بھولو

افلاک تو اس عہد میں ثابت ہوئے معدوم
اب کیا کہوں جاتی ہے مری آہ کہاں تک

ہم فلسفہ کو کہتے ہیں گمراہی کا باعث
وہ پیٹ دکھاتے ہیں کہ شیطان یہی ہے

ہوشیار رہ کے پڑھنا اس جال میں نہ پڑنا
یورپ نے یہ کہا ہے یورپ نے وہ کہا ہے
ماں باپ سے شیخ سے اللہ سے کیا کام انکو
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

میں نے اکبر سے کہا آیئے حجرے میں مرے
اس چٹائی پر نمازیں پڑھیں حسب دستور
چھوڑیئے آپ یہ ہنگامہ تعلیم جدید
کاٹ ہی دے گا کسی طرح خداوند غفور
بولا جھنجھلا کے کہ ہے سہل جہنم مجھ پر
اس کی نسبت کہ میں کالج میں ہوں احمق مشہور

اکبر تعلیم نسواں کو معاشرے کی گمراہی و تباہی تصور کرتے تھے۔ان کا کہنا ہے کہ تعلیم نسواں ایک صالح معاشرے کے لیے مرض مہلک ہے جس میں تخریب کا سامان ہے اس سے معاشرہ کی صالح تعمیر محال ہے تعلیم نسواں سے معاشرے میں فساد کا ظہور ہوتا ہے۔لہٰذا اکبر جدید تہذیب اور نام نہاد تعلیم نسواں کی دلدادہ عورتوں کی تنقید کرتے ہیں۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو
پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

اکبر نے جہاں مردوں کی بعض اطوار زندگی کو طنز و ظرافت کے پردے میں تضحیک کی وہیں مغرب زدہ خواتین کو بھی نہیں بخشا۔اکبر کے طنز کا نشانہ ایسی مغرب زدہ عورتیں ہیں جو مغربیت کے دھارے میں بہتی چلی جاتی ہیں۔''بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیویاں'' ان کا مشہور قطعہ ہے اس جیسے چند دیگر اشعار دیکھیے۔

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں
بی بیاں اسکول میں ہیں شیخ جی اسکول میں

بی بی جو طرز مغربی ہو تو کہو
احسان ہے یہ جو مجھ کو شوہر سمجھو

وہ عصر حاضر کے فیشن کو بھی مغربی تہذیب کی دین سمجھتے ہیں۔ مشرقی سادہ لوح عوام مغرب کے فیشن کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ اکبر مشرقی عوام کے خلوص دلی کی سراہنا کرتے ہیں تو ان کی طرز زندگی کو بہتر سمجھتے ہیں۔

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھاکے لندن کی ہوا عہدو فا بھول گئے
پہونچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمن ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
داڑھی خدا کا نور ہے بے شک مگر جناب
فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں

اکبر مغربی تیز رفتار ترقی و پیش رفت خصوصاً مادی ترقیات کو ہدف تنقید بناتے ہیں اور یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ زمین و آسمان اور طبیعات کے میدان میں ریسرچ و تحقیق بے معنی ہے۔ اس کے اثرات بہت اچھے ثابت نہیں ہوتے ہیں۔ اکبر کے مطابق مشینوں اور ٹکنالوجی پر حد سے زیادہ اعتماد انسانی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ اکبر دراصل ٹکنالوجی کے منفی پہلوؤں سے روشناس کراتے ہیں ہیں لیکن جب دیکھا کہ لوگ ان کی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دے رہے ہیں تو اکبر مذہب کی تعلیم اور اخلاقیات کی تعلیم دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

اہل غرور و حرص کو کیا علم سے شرف
تا چرخ بھی پہنچ کر وہ شیطان ہی رہے
اٹھی نگاہ دیر میں لیکن جھکا نہ سر
پیش صنم بھی ہم تو مسلمان ہی رہے

مذہب چھڑا عشوہ دنیا نے شیخ سے
دیکھی جو ریل اونٹ سے آخر اتر پڑے
بھولتا جاتاہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائے گی بھاپ
دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

اکبر کی شاعری کے مختلف جہات کے جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا مقصد زندگی کی اصلاح و تنقید تھی۔ ان کے دل میں قوم و ملت کے تئیں ہمدردی تھی۔ مستقبل کی نسلیں ان کے فن کا مطالعہ کر زندگی بہتر کر سکتی ہیں اور اپنی تہذیبی روایات کی بقا و دوام کی خاطر احتیاط کر سکتی ہیں۔ اکبر نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قوم کی نذر کر دیا۔ گویا اکبر ایک عہد تھے۔ جن کو بھی اکبر کا مطالعہ کرنا ہو، ان کے عہد کی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہونا ہو، ان کے حالات کو جاننا ہو، ان کی وراثت ان کی روایت ان کے لئے ان کے سارے مسائل کا حل ہے۔ اکبر کی شاعری اور فن کے مطالعہ سے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

☆☆☆

سمینار میں آن لائن مقالہ پیش کرتے ہوئے، ڈاکٹر عرشیہ جبین (حیدر آباد)، ڈاکٹر قاضی نوید (اورنگ آباد)، نیچے کی تصویر میں دائیں سے

ڈاکٹر علی بیات (ایران)
ڈاکٹر آصف زہری (دہلی)
ڈاکٹر سلیم محی الدین (پربھنی)

ڈاکٹر محمد تابش خان اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے۔ دوسری تصویر میں سامعین کو دیکھا جاسکتا ہے۔

30/ جنوری کو مہاتما گاندھی کی برسی پر سنگیت منڈلی بھجن گاتے ہوئے۔

سمینار میں محمد ہاشم خان کے افسانوی مجموعے ''کہانیوں سے پرے'' کی پہلی رونمائی کے موقع پر، بائیں سے جناب محمد ہاشم خان (افسانہ نگار)، درمیان میں جناب ریاض احمد منصوری (شاعر اور مبصر) اور دائیں جانب ڈاکٹر احرار اعظمی۔

RNI NO. MAHURD/2015/66804

हिन्दुस्तानी ज़बान
जनवरी-मार्च 2022
वर्ष 8 अंक 1
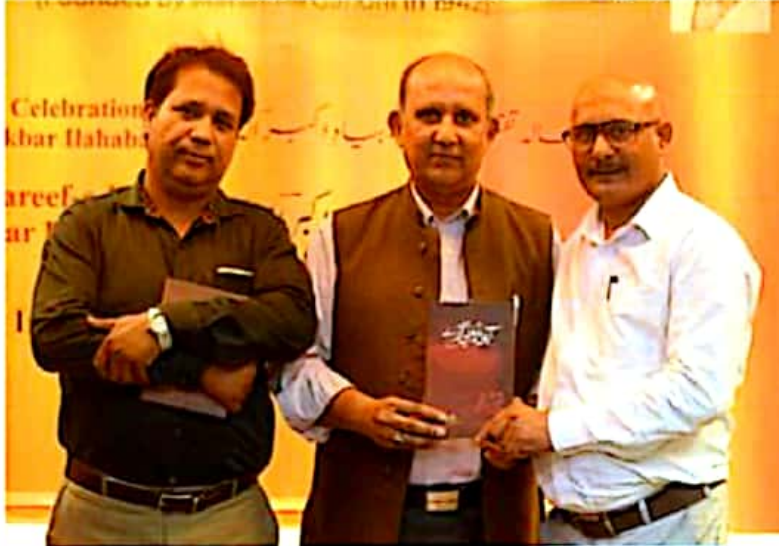
ہندستانی زبان
جنوری۔مارچ ۲۰۲۲ء
سال : ۸ شمارہ: ۱
ISSN 0378-3928
Listed in UGC-CARE List

سید اکبر حسین رضوی اکبر الہ آبادی

پیدائش : ۱۸۴۶ء ۔ وفات : ۱۹۲۱ء

اکبر مجھے شک نہیں تری تیزی میں
اور تیرے بیان کی دلآویزی میں
شیطاں عربی سے ہند میں ہے بے خوف
لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

غزل

سعادت ہے تری دھن میں خودی سے بے خبر ہونا
ترے ہونے کے آگے کچھ نہیں ہونا ہے ہر ہونا
تعجب خیز ہے انشائے ہستی پر نظر ہونا
خبر کا شوق رکھنا مبتدا سے بے خبر ہونا
زمیں زیر قدم پاکر بشر نے پاؤں پھیلائے
نہ رکھا یاد اس نے چرخ کا بالائے سر ہونا
قیامت ہے مرا جوش طبیعت ان کی کم عمری
مرا بے چین ہونا اور ان کا بے خبر ہونا
سیہ خانہ وہی ہے اور وہی سوز غم فرقت
مرے کس کام آیا آپ کا رشک قمر ہونا
پریشاں ہوکے کھوجانے میں اک معنی ہیں اے اکبر
نہیں تو بات کیا ہے عاشق زلف و کمر ہونا
مٹادو رنگ وحدت میں خودی کا نقش اے اکبر
اگر ثابت کیا چاہو تم اپنا معتبر ہونا

Publisher and Printer Shri Feroze Patch in the editorship of Sanjiv Nigam printed "Hindustani Zaban" magazine at Fortune Prints 'N' Bind PVT TD. 211, 212, 213, 235 Pragati Industrial Estate, N. M. Joshi Marg, Delisle Road, Lower Parel East, Mumbai - 400011 and published at Mahatma Gandhi Memorial Research Centre, Mahatma Gandhi Building, 7, Netaji Subhash Road, Mumbai - 400002.